عبدالرحمن ناصر
اصلاحی بی اے (جامعہ)
(سیدھا ... پور، سرائے میر، اعظم گڑھ)

الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

Scanned by CamScanner

جلد ۱ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۶ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

شذرات — امین احسن اصلاحی — ۲-۴

باب التفسیر

تفسیر سورۂ فیل — مصنفہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ — ۵-۱۱

معارف قرآن

استاذ امامؒ کے ترجمۂ قرآن کا نمونہ — ۱۲-۱۵

قرآن میں تکرار کی نوعیت اور قصۂ آدمؑ و شیطان — مولوی ابواللیث شیر محمد صاحب ندوی، اصلاحی — ۱۶-۲۴

مذاکرہ

سورۂ ہود کے متعلق ایک اہم سوال کا جواب — مولوی ابواللیث شیر محمد صاحب ندوی، اصلاحی — ۲۵-۳۲

موعظت

نماز — امین احسن اصلاحی — ۳۳-۴۲

مقالات

اسلام اور غیر مسلم اقوام — چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی۔ اے — ۴۳-۵۸

ادبیات

استاذ امامؒ کے چند متفرق اردو اشعار — ۵۹

تلخیصات

علمائے یورپ کا معیار بحث و نظر — ا۔ ث — ۶۰-۶۳

امید و یاس — ع۔ د — ۶۳-۶۴

Scanned by CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

دو غم انگیز حادثے!

پچھلے دو مہینوں میں ہمارے مدرسہ کو اپنے دو مخلص ہمدردوں کا ماتم کرنا پڑا۔ ایک شیخ سلطان احمد صاحب نعمانی مرحوم۔ دوسرے حاجی شیخ محمد صاحب انصاری مرحوم۔

شیخ سلطان احمد صاحب نعمانی، آنریبل جسٹس اقبال احمد صاحب نعمانی (جج ہائیکورٹ الہ آباد) کے چھوٹے بھائی تھے۔ ہماری ملاقات ان سے سرسری اور بالکل تازہ تھی لیکن مدرسہ کے ساتھ ان کی محبت اور ہمدردی دیرینہ تھی۔ ان سے جب جب ملنے کا اتفاق ہوا ان کے جوش اخلاص اور محبت نے گرویدہ کر لیا۔ آخری ملاقات، شوال کے مہینہ میں، مرحوم کے وطن بندول میں ہوئی تھی، جو چند لمحوں سے زیادہ نہیں رہی لیکن انہی چند لمحوں کے اندر ان کی خوش اخلاقی اور تواضع نے دل پر ان کی محبت کا ایک پائدار نقش قائم کر دیا۔ قومی اور تعلیمی معاملات سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ دائرہ حمیدیہ اور الاصلاح کے منصوبہ کا انھوں نے جس جوش سے خیر مقدم کیا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس مژدہ جانفزا کے لئے ایک عرصہ سے منتظر تھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے اعزا و متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

حاجی شیخ محمد صاحب مرحوم، استاذ امام مولانا حمید الدینؒ فراہی کے برادر عم زاد تھے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے قائم کئے ہوئے انگریزی مدرسہ، شبلی جارج ہائی اسکول (اعظم گڈھ) کی انھوں نے جس اخلاص و ایثار کے ساتھ خدمت کی وہ قومی خادموں کے لئے ایک قابل تقلید مثال ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کی تمام مجالس کے وہ رکن تھے۔ مدرسہ کے رشتۂ سیاست میں جب کبھی کوئی گرہ پڑی، اس کے کھولنے میں، ان کے ناخن تدبیر نے ہمیشہ کارکنون

کی مدد کی۔ وہ نہایت وجیہ اور پرشکوہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت متین اور سنجیدہ تھے۔ ان کا دماغ نہایت سلجھا ہوا تھا۔ سخت سے سخت اشتعال کے مواقع میں بھی وہ اپنے لب ولہجہ کی شرافت اور دماغ کا توازن قائم رکھنے کے عادی تھے۔ ان کا ارادہ اٹل تھا۔ ان کی جرأت وجانبازی میں سپاہیوں کا جوش تھا۔ انکی موت نے ایک نہایت قیمتی وجود سے ہم کو محروم کردیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے متعلقین کو رضا بالقضاء کی توفیق سے نوازے۔

دائرہ حمیدیہ کے معاونین،

"دائرۂ حمیدیہ کی اعانت" کے عنوان سے ہم نے جو اعلان کیا ہے بعض مخلصین نے اس کی طرف توجہ فرمائی۔ اس وقت تک مندرجہ ذیل نام معاونین کی فہرست میں درج ہوچکے ہیں۔

جناب مولوی محمد عمر صاحب نعمانی (شملہ) جناب منشی ممتاز حسین صاحب (لیبر اینڈ انڈسٹریز آفس دہلی) جناب مولوی نور احمد صاحب (شاہ آباد) جناب منشی نجیب اللہ صاحب (پینانگ) جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی (مدرسۃ الاصلاح) جناب شیخ عبدالحی صاحب (موضع بندی کلاں، اعظم گڈھ)

ہم ان مخلصین ومعاونین کے دل سے شکرگذار ہیں، خصوصاً جناب مولوی محمد عمر صاحب نعمانی کے جوش اخلاص ومحبت کا دل پر خاص اثر ہے۔ وہ حلقۂ معاونین وخریداران الاصلاح کی توسیع میں برابر ساعی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے۔

ہندوستان کے طول وعرض میں، استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی کے معارف کے قدرداں ہزاروں ہونگے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم کو ستو آدمی بھی ایسے مل جائیں جو دس دس روپیے سالانہ دیکر دائرہ کے معاونین میں شامل ہوجائیں تو شاید دو سال کے اندر ہم مولانا کی تصنیفات کا بیشتر حصہ چھاپ کر شایع کردیں۔ اسطرح اولاً تو تھوڑی مدت میں معارف قرآنی کا یہ قیمتی ذخیرہ وقف عام ہوجائیگا، ثانیاً معاونین کی خدمت میں دائرہ کی طرف سے اتنی مطبوعات پیش کیجائینگی جو ان کی فیاضی اور حسن اعانت کا ایک حد تک معاوضہ ہوسکیں گی اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کے ہم دل سے خواہشمند ہیں۔

Scanned by CamScanner

مدرسۃ الاصلاح کی مسجد

مدرسۃ الاصلاح کی عالیشان مسجد تعمیر کے آخری مرحلہ سے گذر رہی ہے معماروں نے کام شروع کر دیا ہے۔ سامنے کے دونوں میناروں میں سے ایک مینارہ کا کام ختم ہو گیا ہے اور جس سرعت و مستعدی سے کام جاری ہے اس سے توقع ہوتی ہے کہ دو تین ہفتوں کے اندر دوسرے مینارے سے فارغ ہو کر کاریگر دوسرے بقیہ کاموں کی تکمیل میں مشغول ہو جائینگے۔ قبلہ حاجی رشید الدین صاحب انصاری بہ نفس نفیس نگرانی فرما رہے ہیں ضرورت کے وقت مخدومی مولانا مسعود علی صاحب ندوی بھی تشریف لاتے ہیں۔

مسجد کی اصلی ہیئت جسقدر نمایاں ہوتی جاتی ہے چشم تصور کے سامنے اسیقدر اسکا حسن بے حجاب ہوتا جاتا ہے۔ خیال ہے کہ یہ مسجد اگر اللہ تعالیٰ نے مجوزہ نقشہ کے مطابق اسکی تکمیل کا سامان کر دیا، خوبصورتی، سادگی اور استحکام کا ایک بہترین مجموعہ ہو گی۔

ماہرین کا تخمینہ ہے کہ دو ڈھائی ہزار روپیہ میں تمام کام مکمل ہو جائیگا۔ یہ رقم کوئی بڑی رقم نہیں ہے جس کام پر ہزاروں روپیہ قوم کا صرف ہو چکا ہے، تھوڑی سی رقم کیلئے اسکا رُکا رہنا ہماری بے حسی کی دلیل ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کے ہزاروں ہمدردوں کے سامنے مسجد کی یہ آخری اپیل ہے۔ اگر مدرسہ کا ہر ہمدرد صرف ایک مزدور کی ایک دن کی مزدوری سے شریک اعانت ہو جائے تو ڈھائی ہزار سے کئی گنا زیادہ رقم فراہم ہو جائیگی امید ہے کہ حصول سعادت کے اس آخری موقعہ کو لوگ ہاتھ سے نہ دینگے۔

ہمارے مخدوم مولانا محمد شفیع خاں صاحب (نائب ناظم مدرسۃ الاصلاح) نے مسجد کے متعلق قوم سے جو اپیل کی ہے اسمیں مسجد کی تکمیل کو اپنی زندگی کی "آخری آرزو" سے تعبیر کیا ہے۔ انھوں نے اس کیلئے عملی جد و جہد بھی شروع کر دی تھی لیکن مہینوں سے وہ صاحب فراش ہیں، علالت نے تشویش انگیز صورت اختیار کر لی ہے۔ قارئین ان کیلئے دعائے صحت فرمائیں، اور انکی زندگی کی اس محبوب ترین آرزو سے جو بستر علالت پر بھی انکو سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہے، بے پرواہ نہ ہوں۔

مستفسرین سے معذرت

بعض مستفسرین نے استفسارات بھیجے ہیں۔ ان کے جوابات قلمبند ہو چکے ہیں لیکن صفحات کی کمی کی وجہ سے رسالہ کے تمام ابواب کا پابندی نباہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس مرتبہ مذاکرہ کا باب تمسکل قائم رکھا جا سکا بعض مستقل ابواب کے نہایت ضروری مضامین روک لینے پڑے۔ اسلئے جب تک صفحات بڑھا نہ دئے جائیں، لوگ جوابات کیلئے مستعجل نہ ہوں۔

Scanned by CamScanner

عبدالرحمن ناصر

باب التفسیر

تفسیر سورۂ فیل

۳

مصنفہ

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

مترجمہ

(امین احسن اصلاحی)

اصحاب فیل کا واقعہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق

۶۔ "اصحاب فیل" کا واقعہ، اجمالاً اور تفصیلاً، دونوں طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اجمالاً تو خود قرآن مجید نے بیان کردیا ہے اور اسکی تفصیلی شکل وہ ہے، جو مختلف قسم کی صحیح وضعیف روایات سے اخذ کرکے پیش کی گئی ہے۔ مفسرین عموماً قصہ کی تمام تفصیلات، روایات سے اخذ کرکے بیان کرتے ہیں اور ضعیف وقوی روایات میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ شکل مضر اور عموماً صحیح تاویل تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ واقعہ کی منصوص شکل روایات سے بالکل الگ کرکے دیکھی جائے۔ اس کے بعد روایات پر نظر ڈالی جائے اور کمزور روایات کو چھانٹ کر الگ کیا جائے۔ پہلے قرآن مجید پر غور کرنا چاہئے۔

قرآن مجید نے، اس واقعہ کو نہایت مجمل طریقہ پر بیان کیا ہے۔ اس سے نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ اور نہ یہ صاف پتہ چلتا کہ کعبہ کے ڈھانے کے لئے آئے تھے۔ اس اجمال کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ نہایت مشہور تھا حتی کہ عربوں نے اسی سے اپنی تاریخ کا آغاز کیا اور ان کے اشعار میں بکثرت

Scanned by CamScanner

اس کا تذکرہ ہوا، (دیکھو فصل ۱۰) اور چونکہ اجمالی بیان کسی واقعہ کی غایت شہرت کی دلیل ہے، اسلئے بلاغت قرآن نے اسی پہلو کو ترجیح دی۔ چنانچہ کلام کا آغاز "اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ" سے ہوا ہے۔ یہ طریق خطاب اسی وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب جماعت کا ہر فرد، واقعہ سے اس طرح واقف ہو گویا اس کا عینی شاہد ہے۔ کسی امر کا اقرار کرانے کے لئے بھی عربی زبان میں یہی اسلوب ہے۔ جب یہ انداز کلام اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے بعد کسی مشہور و معروف ہی بات کا ذکر آتا ہے، ایسے مواقع پر تفصیل مناسب نہیں ہوتی۔ مثلاً سورہ فجر میں ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۝ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۝ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ (الفجر-۶-۱۳)

کیوں دیکھا نہ تیرے خداوند نے عاد کے ساتھ کیا کیا؟ ستونوں والے ارم کے عاد جس کا نظیر کسی ملک میں نہیں تھا اور ثمود کے ساتھ جنھوں نے وادی میں پتھر کاٹے اور میخوں والے فرعون کے ساتھ، یہ سب جنھوں نے ملک میں سر اٹھائے اور بڑی بڑی خرابیاں ڈالیں، سو تیرے خداوند نے ان پر عذاب کے تازیانے برسائے۔

دیکھو، ان قوموں کی جو خصوصیتیں نہایت مشہور تھیں انہی کی طرف اجمالی اشارے کر دئے ہیں۔ اسی طرح اصحاب فیل کے قصے میں بھی، اجمال و اشارہ ہی مناسب تھا۔ تمام واقعہ میں سے اتنا حصہ بیان کر دیا جتنا اس سورہ اور بعد والی سورہ کے موقع اور نظم کا تقاضا تھا۔ گویا قصہ کا اجمالی خلاصہ یہ ہوا کہ اصحاب فیل جنھوں نے بیت اللہ کی تخریب کی سازش کی تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کر دیا۔ اس کی بیشمار فوجوں میں سے ایک فوج نمودار ہوئی اور اس نے پتھراؤ کر کے ان کو پارہ پارہ کر دیا تاکہ ان کو حرم کے ساتھ گستاخی کی سزا دے اور قریش خصوصاً قریش پر احسان فرمائے۔

واقعہ کا اتنا حصہ منصوص ہے۔ اس میں روایات کو خلط نہیں کرنا چاہیے۔ روایات پر الگ غور و بحث کرنا چاہیے تاکہ صحیح واقعہ منقح ہو سکے۔ اب ہم اسکی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ تین عنوانوں سے غور کرینگے۔

۱۔ وہ روایات جو ابرہہ کے حملہ اور عربوں کے ساتھ اس کے واقعات و حالات سے متعلق ہیں۔

Scanned by CamScanner

۲۔ وہ روایات جو اصحابِ فیل کی سنگباری سے متعلق ہیں۔

۳۔ روایات متعلق واقعہ طیر۔

ابرہہ کے حملہ کا سبب، اہل مکہ کا فرار، عبدالمطلب سے گفتگو

۷۔ ابرہہ کے حملہ کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ عربوں سے ناراض ہو گیا تھا، لیکن یہ وجہ اور اہل مکہ کے فرار اور ابرہہ و عبدالمطلب کی گفتگو سے متعلق، جو حالات بیان کئے گئے ہیں، سب یکقلم بے بنیاد ہیں۔ از روئے سند ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں۔ یہ تمام روایات ابن اسحاق تک منتہی ہوتی ہیں اور اہل فن کے نزدیک یہ طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے روایت کرتے ہیں۔ نیز دوسری روایات سے ان کی تردید ہوتی ہے۔ پھر عربوں کا مشہور کیرکٹر بھی ان باتوں سے ابا کرتا ہے۔

خود واقعات کی نوعیت سے، صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام باتیں دشمنوں کی گڑھی ہوئی ہیں۔ ان میں عربی غیرت و حمیت کی علانیہ تحقیر اور قریش کے غیور سردار عبدالمطلب کی بیباکانہ توہین ہے۔ ابرہہ کے کیرکٹر کو اجاگر کیا گیا ہے اور ایک شخص پر ایک کنیسہ کی توہین کا الزام تراش کر بیت اللہ الحرام پر ابرہہ کے حملہ کو جائز دکھایا گیا ہے۔ الغرض ذلت و دناءت اور بے غیرتی و دوں ہمتی کا کوئی ایسا الزام نہیں ہے جو قریش اور عرب اور ان کے سردار پر نہ تھوپا گیا ہو۔ ان خرافات کی تردید پر اپنا وقت ضائع کرنیکا موقع نہیں ہے تاہم مختصراً ان وجوہ کو دکھانا ہے، جن سے ان روایات کی تکذیب ہوتی ہے۔

۱۔ بیان کیا جاتا ہے، جب ابرہہ نے حملہ کیا، عبدالمطلب نے کہا، اس گھر کا رب اس کی حفاظت کریگا، اس کے بعد خانہ کعبہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک دعا مانگی اور تمام اہل مکہ کو لیکر پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا چھپے، لیکن دنیا کے پردے میں، کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی عبادت گاہ کو خدا کا گھر نہ سمجھتی ہو، پھر اس سے اس بے حمیتی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ بغیر کسی مدافعت کے، اپنا معبد دشمنوں کے حوالہ کر کے پہاڑوں میں جا چھپے گی۔ اسطرح کی بے حمیتی تو ہم دنیا کی ادنیٰ

قوموں کی نسبت بھی باور نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ قریش اور بنی اسماعیل جنکا تمام تر سرمایۂ فخر و نازش ہمیشہ شہسواری شمشیرزنی اور قدر اندازی ہی رہا ہے، یہانتک کہ غیروں کو بھی اعتراف ہے کہ اسی جوہر کی بدولت انھوں نے کبھی اپنی آزادی پر آنچ نہ آنے دی۔

۲- روایات میں ہے کہ عبد المطلب کے کچھ اونٹ ابرہہ کے آدمی ہنکالے گئے تھے۔ عبد المطلب ان کے مانگنے کیلئے ابرہہ کے پاس گئے۔ ابرہہ نے ان کی نہایت عزت کی تخت شاہی سے اتر کر فرش پر بیٹھ گیا اور ان کو اپنے پہلو میں بٹھایا پھر گفتگو شروع ہوئی۔ اس نے کہا "آپ اپنے سو اونٹوں کے لئے مجھ سے ملنے آئے، حالانکہ میں کعبہ کو ڈھانے کیلئے آیا ہوں، جو آپ کا اور آپکے آباؤ اجداد کا دینی مرکز ہے لیکن آپ اس کی نسبت مجھ سے ایک حرف نہیں کہتے"۔ غور کرو، عبد المطلب کے ساتھ وہ جس اخلاق سے پیش آیا اور جس طرح باتیں کیں اس سے پوری امید تھی کہ اگر وہ اس سے خانہ کعبہ کے بارہ میں کوئی خواہش کرتے تو وہ رد نہ کرتا، ایسی حالت میں کیسے ممکن تھا کہ اس معاملہ کو وہ بالکل ٹال جاتے؟ پھر سب بڑا سوال یہ ہے کہ انکی قریشی حمیت نے چند اونٹوں کے لئے، اس کی خوشامد کا ننگ کیونکر گوارا کیا!

۳- اہل سیر تسلیم کرتے ہیں کہ ابرہہ کے حملہ کے روز اول سے، قبائل عرب، وقتاً فوقتاً اسکی فوج پر تاخت کرتے رہتے تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عرب عموماً اس کے مخالف بلکہ آمادۂ جنگ تھے۔ ابرہہ کے ساتھ انکی معرکہ آرائیوں کا ہر جگہ چرچا تھا، بعض شعرانے اس پر فخریئے لکھے۔ قدیم اسلامی شاعر ذو الرمہ کہتا ہے۔؎

وابرهة اصطادت صدور رماحنا جهارا وعثنون العجاجة اكدر

اور ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا۔

تنحى له عمرو فشك ضلوعه بنافذة نجلاء والخيل تصبر

عمرو نے اس کی طرف لپک کر نیزے کے کاری زخم سے، اس کی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم تھے

ان شعروں میں صاف تصریح ہے کہ اس کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ مارا اور یہ واقعہ جس دن پیش آیا، کثیف غبار آسمان تک بلند تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اللہ تعالی نے ہوا کا طوفان بھیجکر ان پر سنگریزوں کی بارش کی تفصیل دسویں فصل میں آئے گی۔ الغرض یہ مسلم ہے کہ عربوں نے اپنے مقدس شہر کی حفاظت کی۔

Scanned by CamScanner

یہ بات ہر طرح قرین عقل ہے۔ تمام عرب دل سے کعبہ کی عزت کرتے تھے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش اسقدر مرعوب ہوجائیں کہ اس چیز کی حمایت کے لئے بھی ان کے خون میں کوئی حرارت نہ پیدا ہو جس پر ان کی تمام عظمت و سیادت کی بنیاد تھی، دین و مذہب کا سوال چھوڑ دو وہ اپنے آبائی شرف کی تمام کائنات جیتے جی کیسے برباد ہوتے دیکھ سکتے تھے!

۴۔ علمائے سیر کے بیان کے مطابق، ابرہہ کا حملہ موسم حج میں ہوا تھا بعض شعراء کے اشعار سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے چنانچہ ابرہہ کے آدمی قربانی کے کچھ اونٹ بھی ہنکالے گئے تھے عکرمہ بن ہاشم بن عبد مناف نے اسکا تذکرہ کیا ہے۔

لاهم اخز الاسود بن مقصود الآخذ الهجمة فيها التقليد

خداوندا! اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جنکی گردنوں میں قلادے تھے، ہنکالے گیا

بين حراء وثبير فالبيد يحبسها وهي اولات التطريد

حرا، ثبیر اور بید کے درمیان ان کو روکا اور وہ ہنکالے جانے کے لئے تھے۔

فضمها الى طماطم سود اخفره یارب وانت محمود

پھر ان کو حبشی غلاموں کے حوالہ کیا۔ خداوندا! تو اسکو اپنی امان سے محروم کردے۔ تو سزاوار حمد ہے۔

اس لئے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قریش ہمت ہار گئے تھے، تو کیا تمام عرب نے سپر ڈالدی تھی؟ اور پڑھ چکے ہو کہ ان کے اکّا دکّا قبائل، وقتاً فوقتاً، ابرہہ کی فوج پر چھاپے مارتے رہتے تھے۔ پھر تعجب ہے کہ جب ایک مرکز سے، پوری مجتمعہ طاقت کے ساتھ، عین کعبہ کے سامنے، دشمن سے مقابلہ کا وقت آیا تو سب دبک گئے! ایسی فضول بات کون باور کرسکتا ہے؟

۵۔ عرب شعراء نے قبیلہ ثقیف کی ہجو کی ہے کہ خانہ کعبہ کی حمایت کے وقت، اس نے بزدلی دکھائی اور دشمن سے ساز باز کرلیا۔ چنانچہ ضرار بن خطاب کا شعر ہے۔

وفرت ثقيف الى لاتها بمنقلب الخائب الخاسر

اور ثقیف ایک نامراد بھاگنے والے کی طرح اپنے معبود لات کی طرف بھاگ گئے۔

ابرہہ کے ساتھ قبیلہ ثقیف کے ساز باز پر تمام روایات متفق ہیں اور ابو رغال ثقفی کی قبر، اس گناہ پر کہ

Scanned by CamScanner

اس نے ابرہہ کی فوج کو رستہ بتایا تھا سنگسار کی گئی۔ پھر غور کرنے کی بات ہے کہ اگر ثقیف کی طرح تمام عرب بھاگ گئے تھے تو قبیلہ ثقیف اور ان کا سردار ہی کیوں مستحق ملامت ٹھیرا؟ ان کا عذر بھی بالکل واضح تھا۔

۶ کہا جاتا ہے کہ ابرہہ نہایت بردبار آدمی تھا۔ وہ اس قسم کا اقدام نہ کرتا لیکن قبیلہ فقیم کے ایک آدمی نے ایک کنیسہ میں گھس کر بقصد توہین اس کو نجس کر دیا جس سے اس کو اشتعال ہوا، اور اس نے خانہ کعبہ پر فوج کشی کر دی۔ لیکن ابرہہ کی پوری سوانح عمری اس حسن ظن کے خلاف ہے۔ وہ نہایت متعصب تھا۔ اس نے جب یمن پر قبضہ کیا، وہاں کے یہودی امیر اریاط کو قتل اور یمن سے یہودیت کا بیخ و بن سے خاتمہ کر دیا، پھر ایک شاندار گرجا بنوایا اور نجاشی کو لکھا کہ میں نے آپ کے لئے ایک ایسا گرجا تعمیر کرایا ہے جسکی نظیر چشم فلک نے نہ دیکھی ہوگی۔ میں نے تہیہ کیا ہے کہ عربوں کے حج کا رخ بھی اسی طرف پھیر دوں۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو ابرہہ نے ٹھیک سوچا، خانہ کعبہ کی محبت عربوں کے خون میں گھلی ہوئی تھی۔ وہ اسکو اپنے باپ ابراہیمؑ کی تعمیر اور اپنا دینی و دنیاوی مرکز سمجھتے تھے۔ ان کو اس سے پھیرنا ناممکن تھا۔ اس سنگ گراں کو راہ سے ہٹانے کی تدبیر صرف یہی تھی کہ اس کو یکقلم ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا جائے۔ واقعات کا یہ سلسلہ بالکل فطری معلوم ہوتا ہے باقی کنیسہ کو نجس کر دینے کا واقعہ تو بالکل گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یا تو اس لئے گڑھا گیا ہو کہ ابرہہ کی بربادی کا کوئی سبب پیدا کیا جائے یا بوجہ حسن ظن اس کی اس شنیع جرأت کے لئے ایک وجہ عذر تلاش کی گئی ہے۔ درمنثور میں اسی قسم کی ایک اور روایت بھی ہے، جس میں حملہ کا سبب دوسرا بتایا گیا ہے، لیکن مقصود ایک ہی ہے۔

"عثمان بن مغیرہ بن اخنس سے روایت ہے کہ اصحاب فیل کا قصہ یوں ہے کہ ابرہہ اشرم حبشی یمن کا بادشاہ تھا، اس کا نواسہ اکسوم بن صباح حمیری حج کے لئے گیا، مکہ سے واپسی میں نجران کے ایک گرجے میں اترا اہل مکہ کی ایک جماعت نے گرجے پر ڈاکہ ڈالا اور گرجے کے سامانوں کے ساتھ اکسوم کا تمام سامان بھی لوٹ لیا، اکسوم نے اپنے نانا سے فریاد کی، اس نے اپنے درباریوں میں سے ایک شخص شہر بن معقود کی قیادت میں تیس ہزار آدمی روانہ کئے۔"

Scanned by CamScanner

اصحاب فیل کے حملہ کے متعلق صاحب درمنثور نے اسی روایت پر اعتماد کیا ہے لیکن اس کی لغویت بالکل واضح ہے۔ جب ایسی روایات موجود ہیں، جو ابرہہ کے حالات اور واقعات کی طبعی رفتار سے پوری مطابقت رکھتی ہیں تو اس قسم کی روایات لینے کی کیا ضرورت ہے

۷۔ قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب فیل نے ایک مخفی تدبیر (کید) کی تھی، لیکن روایات میں اسکے حملے کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں، ان میں مخفی تدبیر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وہ قوت کی نمائش اور عرب کی تذلیل کی ایک کھلی ہوئی کارروائی ہے۔ البتہ قابل اعتماد روایات سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی تدبیر) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں مثلاً

۱۔ اس نے اشہر حرم میں حملہ کیا، کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ و خونریزی سے احتراز کرتے ہیں

۲۔ اس نے مکہ میں ایسے وقت میں داخل ہونا چاہا جب تمام اہل مکہ، دوسرے عربوں کے ساتھ حج میں ہوتے ہیں

۳۔ اس نے خاص طور پر ایام تشریق میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں مقیم ہوں گے یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس آ رہے ہوں گے۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھکر اب غور کرو کہ خداوند تعالیٰ نے ان کی چالوں کو کس طرح برباد کیا۔

۱۔ ان کی فوج کو بطن محسر ہی میں روک دیا۔

۲۔ محسر کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا۔

۳۔ خدا نے آسمان سے سنگریزے برسانے والی آندھی بھیجی۔

ان تفصیلات سے معلوم ہو گیا کہ اہل مکہ نے پوری قوت سے، اصحاب فیل کا مقابلہ کیا اور ان پر پتھراؤ کیا۔ باقی رہی ابرہہ کی بربادی اور شرافت کی داستان تو یہ عقل و نقل اور قرآن، سب کے خلاف ہے۔

(باقی)

Scanned by CamScanner

معارفِ قرآن

استاذ امامؒ کے ترجمۂ قرآن کا نمونہ

گذشتہ اشاعت میں، استاذ امام علامہ فراہیؒ کے جس ترجمۂ قرآن کا تذکرہ کیا گیا تھا، اس میں سے چند سورتوں کا ترجمہ اس نمبر میں دیا جاتا ہے۔ اس کے مطالعہ کے وقت ان اصولوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے جن کی طرف مولاناؒ نے اپنی یادداشت میں اشارہ کیا ہے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس ترجمہ میں ان اصولوں کی کہاں تک رعایت کی گئی ہے۔ اس ترجمہ کے محاسن اس وقت اور زیادہ نمایاں ہوں گے جب حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ دہلوی اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم دہلوی کے ترجمے پیش نظر ہوں۔ اس میں اور مذکورۂ بالا حضرات کے ترجموں میں جو فرق ہے اس پر مفصل بحث کرنے کا خیال تھا لیکن اسوقت اس کا موقع نہیں۔ مجملاً اس قدر خیال رکھنا چاہیئے کہ ڈپٹی صاحب کے ترجمہ میں شانِ ترجمہ مفقود ہے وہ مفہوم کو واضح کرنے کیلئے اپنی طرف سے قوسین میں اضافے کرتے ہیں۔ یہ اضافہ کہیں کہیں اصولِ زبان اور اسلوبِ عرب کے مطابق ہوتا ہے اس لئے مفید ہوتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں یہ طریق ترجمہ مخدوش ہے۔ شاہ صاحب کا ترجمہ بالکل اصل کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، لیکن اس میں اس قدر ابہام ہے کہ اکثر جگہ مفہوم سمجھنا دشوار ہے۔ زبان کی قدامت مزید براں ہے۔ ان دونوں ترجموں میں اسلوب کلامِ عرب کی رعایت بھی کم ہے۔ استاذ امامؒ کے ترجمہ میں شانِ ترجمہ باقی ہے۔ ابہام بالکل نہیں ہے اور اسلوب کلام عرب کی رعایت کا پورا اہتمام ہے۔

(اختر احسن اصلاحی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷

کیوں تو نے دیکھا روزِ جزا کے جھٹلانے والے کو (۱) یہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے (۲) اور فقیر کھلانے سے روکتا ہے (۳) تو برا ہو اُن نمازیوں کا (۴) جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں (۵) جو ریاکاری کرتے ہیں (۶) اور ادنیٰ سی چیز مانگے نہیں دیتے (۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْقُرَيْشِ مَكِّيَّةٌ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝۲ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴

اس لئے کہ قریش کو الفت بخشی (۱) جاڑے اور گرمی کے سفر میں (۲) تو ان کو چاہئے کہ عبادت کریں اُس گھر کے خداوند کی (۳) جس نے اُنھیں کال میں کھلایا اور ڈر میں نچنت کیا (۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ التِّيْنِ مَكِّيَّةٌ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝۱ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝۶ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝۷ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝۸

Scanned by CamScanner

شاہد ہے انجیر اور زیتون (۱)، اور طور سینین (۲)، اور یہ پرامن سرزمین (۳)، کہ بے شک ہم نے آدمی کی ساخت اچھی سے اچھی بنائی (۴)، پھر ہم نے اُسے ادنیٰ سے ادنیٰ درجے میں ڈالدیا (۵)، ہاں مگر جو کہ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں سو اُنھیں ہمیشہ کے لئے انعام ملے گا (۶)، سو اب کیا ہے جس سے تو جزا کو جھٹلاتا ہے (۷)، کیا خدا سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟ (۸)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الطَّارِقِ مَكِّيَّة

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝۲ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝۳ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا
عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝۴ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝۵ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝۶ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ
الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝۷ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝۸ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝۹ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا
نَاصِرٍ ۝۱۰ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝۱۱ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝۱۲ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝۱۳ وَّمَا
هُوَ بِالْهَزْلِ ۝۱۴ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝۱۵ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝۱۶ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ
رُوَيْدًا ۝۱۷

شاہد ہے آسمان اور شباہنگ (۱)، اور شباہنگ کو تو کیا جانے (۲)، وہ کتا ستارہ (۳)، کہ کوئی جان نہیں جس پر ایک نگہبان نہیں (۴)، پس آدمی کو دیکھنا چاہئے وہ کاہے سے بنا؟ (۵)، ایک اچھلتے پانی سے بنا ہے (۶) جو نکلتا ہے ریڑھ اور پہنسلیوں کے بیچ میں سے (۷)، وہ اُس کے اوٹا دینے پر ضرور قادر ہے (۸)، جبکہ چھپی باتیں پرکھی جاویں گی (۹)، تو وہ بالکل بے کس و بے بس ہوگا (۱۰)، شاہد ہے آسمان پر نگار (۱۱)، اور زمین پر شگاف (۱۲) کہ یہ دوٹوک بات ہے (۱۳)، اور مسخری ہنسی نہیں (۱۴)، وہ چل رہے ہیں ایک چال (۱۵)، اور میں چل رہا ہوں ایک اور چال (۱۶)، سو چھوڑ دے کافروں کو ذرا دیر کو (۱۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

Scanned by CamScanner

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ مَكِّيَّة

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾ وَإِذَا
الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿٥﴾ يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا
غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ﴿٦﴾ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ﴿٧﴾ فِي أَيِّ صُورَةٍ
مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ﴿٨﴾ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ ﴿٩﴾ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا
كَاتِبِينَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ﴿١٢﴾ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١٣﴾ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي
جَحِيمٍ ﴿١٤﴾ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ﴿١٥﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ﴿١٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ
الدِّينِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿١٨﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ
يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ﴿١٩﴾

جبکہ آسمان ٹوٹ جائے گا (۱) اور جب ستارے بکھر جاویں گے (۲) اور جب دریا پھوٹ نکلیں گے (۳) اور جب
قبریں اکلوائی جائیں گی (۴) تب ہر ایک جان، جان لے گی جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا (۵) او
آدمی! تو کس بات پر بھولا ہے اپنے عالی مرتبہ آقا کی نسبت (۶) جس نے تجھے بنایا، ٹھیک اور موزوں کیا (۷)
جس طرز پر اس نے چاہا تجھے ترکیب دی (۸) مگر تم تو جزا کا انکار کرتے ہو (۹) حالانکہ تم پر مقرر ہیں نگراں (۱۰)
دبیران گرامی (۱۱) جو تم کرتے ہو اس کو جانتے ہیں (۱۲) بے شک پرہیزگار عیش میں ہوں گے (۱۳) اور بدکار
دوزخ میں (۱۴) جس میں وہ داخل ہوں گے روز جزا کو (۱۵) اور اس سے وہ چھپنے والے نہیں (۱۶) اور
کیا سمجھا تو روز جزا کو؟ (۱۷) پھر کہتا ہوں کہ تو روز جزا کو کیا سمجھا (۱۸) جس روز ایک جان دوسری جان کے واسطے
کچھ نہ کر سکے گی اور بات اس دن خدا کے ہاتھ ہوگی (۱۹)

Scanned by CamScanner

قرآن میں تکرار کی نوعیت

اور

قصہ آدمؑ و شیطان

از جناب مولوی ابواللیث شیر محمد صاحب اصلاحی ندوی

قرآن مجید پر منجملہ بہت سے اعتراضوں کے، ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ اس کے اندر قصص اور مطالب کی تکرار ہے۔ چند مطالب ہیں جو بار بار دھرائے گئے ہیں اور چند قصے ہیں جنکا اعادہ کثرت سے کیا گیا ہے۔ یہ چیز بار خاطر ہونے کے علاوہ، ایک کتاب کے لئے بہت بڑا عیب ہے۔

اس اعتراض کو دفع کرنے کے لئے، مختلف حضرات نے مختلف جوابات دئے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ کوئی جواب تشفی بخش نہیں ہے۔ بعضوں نے تو صرف یہ کہکر پیچھا چھڑا لیا کہ کلام میں تکرار، عرب کا دستور ہے۔ اور اس کے ثبوت میں کچھ قصائد نقل کر دئے جن میں بعض بعض مصرعوں کی تکرار ہے لیکن حقیقت میں یہ جواب، جواب نہیں ہے، بلکہ اس اعتراض کی صحت کا اعتراف ہے۔ جب ہم عقلاً تکرار کو عیب سمجھتے ہیں تو یہ عیب محض اس لئے ہنر سے نہیں بدل جائیگا کہ شعراء جاہلیت کے کلام میں بھی یہ عیب موجود ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تکرار کی مثالیں، کلام عرب میں بھی، شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ عرب کی فطری ذہانت، بے سود تکرار کے قطعاً منافی ہے۔ ذہانت پر مکرر کلام سننا اور کہنا دونوں ہی بار ہے۔ جن قصائد کو لوگوں نے تکرار کی مثال میں پیش کیا ہے، درحقیقت تکرار ان میں بھی نہیں ہے۔ تکرار، کلام کا ایک بہت بڑا نقص ہے، جسے عیب سمجھ کر ہر شخص اپنے کلام اور اپنی کتاب کو اس سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے پھر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ عیب اس کتاب میں پایا جاتا ہے، جس کے سامنے دنیا کی تمام فصاحت و بلاغت کا دفتر بے حقیقت ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ قرآن میں چند مطالب اور چند قصص کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے۔ اسکا انکار

بداہت کا انکار ہے۔ لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ یہ اعادہ اس قسم کی تکرار ہے جو معیوب ہے، مخل خاطر ہے، بے کیف ہے، بے سود ہے، اور متکلم کی غفلت اور عدم قدرت کا مظہر ہے۔ دنیا کی اور چیزوں کی طرح، تکرار میں بھی نقص و کمال بھلائی اور برائی کے دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ جب تکرار بے موقع اور ناگوار خاطر ہو اور کلام مکرر سے کوئی جدید فائدہ نہ حاصل ہو تو یہ تکرار عیب ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اسے کون عیب کہہ سکتا ہے؟ لوگوں نے جس تکرار کی مذمت کی ہے وہ پہلی قسم کی تکرار ہے لیکن دوسری قسم کی تکرار کو کوئی عقلمند عیب نہیں کہہ سکتا۔ قرآن میں بیشک چند قصص اور چند مطالب کو بار بار بیان کیا گیا ہے لیکن ہر جگہ ضرورت کا تقاضا ہے، موقع و محل کی رعایت ہے، اور پھر ہر جگہ انداز ایسا نرالا اور دلکش ہے کہ بے کیف ہونا تو الگ رہا اس تکرار نے اور زیادہ سامان ذوق فراہم کر دیا ہے۔ بے سود تکرار سے کہیں کام نہیں لیا گیا ہے۔ ہر جگہ جدید فوائد مدنظر ہیں اور جہاں بظاہر کوئی بات مکرر نظر آتی ہے، غور کرنے کے بعد، اس کی حکمتیں اور نت نئے فوائد سامنے آجاتے ہیں۔ اس لحاظ سے غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ قرآن میں تکرار نہیں ہے۔ لیکن شاید معترضین صرف اتنے جواب سے مطمئن نہیں ہو سکتے اس لئے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر مثالوں کی روشنی میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

قرآن میں بظاہر تکرار کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) معانی کی تکرار (۲) جملوں کی تکرار۔ گذشتہ قوموں اور نبیوں کے قصے اور توحید، معاد اور رسالت وغیرہ کے مضامین، قرآن کی تقریباً تمام سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح بہت سے جملے ایسے ہیں، جن کو ایک ہی سورۃ میں بار بار دہرایا گیا ہے، جیسے فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ سورۃ رحمان میں۔ اور وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ سورۃ مرسلات میں۔ انہی مثالوں کو دیکھ کر لوگوں کو خیال ہوتا ہے کہ قرآن بھی لفظی اور معنوی تکرار کے عیب سے پاک نہیں ہے۔

علمائے اس اعتراض کی طرف بحمداللہ توجہ کی ہے اور دونوں قسم کی تکراروں کا جواب دینا چاہا ہے۔ لفظی تکرار کے متعلق تو ان کا وہی مشہور جواب ہے کہ تکرار سے تاکید کا فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن معنوی تکرار کے متعلق ان کے جوابات بہت دلچسپ ہیں۔ بعضوں نے یہ جواب دیا ہے کہ جسطرح ہر پیاس کے بعد پانی پینا اور بھوک کے بعد بار بار کھانا نفس پر بار نہیں ہوتا اور نہ اس پر

کسی کو اعتراض ہوتا ہے، اسی طرح قرآن پڑھنے والے کی روح کو جب جب تشنگی لاحق ہوتی ہے اسکی سیرابی کا سامان ہر قدم پر موجود ملتا ہے۔ کسی نے یہ جواب دیا کہ چند مباحث کو، قرآن کی تمام سورتوں میں، اس لئے بار بار بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے پورے قرآن کو نہ پڑھ سکے تو جتنا پڑھ سکتا ہے اتنا ہی اس کے تمام اہم مطالب سے آگاہ کرنیکے لئے کفایت کر سکے۔ ان کے علاوہ اور بھی جوابات لوگوں نے دیئے ہیں۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ یہ جوابات صحیح ہیں یا غلط۔ البتہ ہمارے نزدیک لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تکراروں کے متعلق، صرف ایک جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ گو بعض مطالب و قصص اور بعض جملے، قرآن مجید میں مکرر معلوم ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ہر جگہ اپنے مخصوص معانی کے اعتبار سے بالکل مستقل اور نئے ہیں۔ قرآن میں تاکید و تثبیت وغیرہ کے لئے، توحید، رسالت اور معاد کا بیان بار بار ہوتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ ان کے بیان و ذکر کی نوعیت جداگانہ ہے۔ کہیں توحید کا بیان اس حیثیت سے آیا ہے کہ اس کا اعتقاد انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ کہیں اس حیثیت سے مذکور ہے کہ اسکا پیام تمام گذشتہ انبیاء نے دیا ہے۔ کہیں اسکا ذکر اس لئے ہوا ہے کہ اس کا اعتقاد، خدا کے بے شمار انعامات کا اقتضا ہے۔ کہیں اس طرح ہوا ہے کہ نظام کائنات کی یکسانی، اس کی ہم آہنگی، اسکا توافق، توحید کا کھلا ہوا پیام ہے۔ وغیر ذالک۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر جگہ توحید کا بیان ایک ہی نہج اور ایک ہی اسلوب سے ہوا ہو۔

اسی طرح معاد کا ذکر کہیں اس لحاظ سے ہے کہ خدا کی صفت عدل اسکی مقتضی ہے۔ کہیں اس اعتبار سے ہے کہ اس کی غایت رحمت و شفقت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں نیک و بد کا امتیاز ہو جائے اور لوگ اپنے اعمال کا ثمرہ پائیں۔ کہیں اس کا ذکر اس طرح ہوتا ہے کہ اگر قیامت نہ آئے تو زمین و آسمان اور خود انسان کی خلقت بے نتیجہ اور عبث ہو جاتی ہے۔ کہیں اس کا تذکرہ اس حیثیت سے ہے کہ اس سے غفلت، کفر و بدکاری کا باعث ہے۔ اور کہیں اس نہج سے ہوا ہے کہ تمام رسولوں نے اس کی طرف دعوت دی ہے۔ بعض مقامات میں، کائنات کے خاص خاص اصول و قوانین کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا ہے کہ ان اصول و قوانین کی بنا پر اس عالم کے بعد ایک دوسرے عالم کا ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح، رسالت کا ذکر کہیں توحید کے اثبات کے لئے ہے اور کہیں اس لحاظ سے ہے کہ خدا کے وجود کا اعتراف، رسالت کے اعتراف کو مستلزم ہے اور کہیں اس پہلو سے ہوا ہے کہ جس طرح خدا اپنے بندوں کی جسمانی راحت و آسائش

کے لئے پانی برساتا ہے، زمین سے غلہ اگاتا ہے، اسی طرح ان کی روحانی سیرابی اور تسکین کے لئے رسولوں کو بھیجتا ہے۔ الغرض یہ تینوں مباحث قرآن کی اکثر سورتوں میں مذکور ہونیکی وجہ سے مکرر معلوم ہوتے ہیں اور اگرچہ اس میں کوئی عیب نہیں کہ تاکید تثبیت کے لئے، ان کے مناہج ذکر میں کہیں کہیں اشتراک ہو جائے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ ان کے ذکر کا پہلو علیحدہ ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مباحث کو الگ الگ مستقل عنوانات کے تحت ذکر کرنے کے بجائے متفرق سورتوں میں کیوں پھیلا دیا ہے؟ لیکن یہ سوال تکرار سے متعلق نہیں بلکہ ترتیب سے متعلق ہے۔ اسلئے اس جگہ ہم اسکو نظر انداز کرتے ہیں۔

جملوں کی تکرار یعنی ترجیعات کا بھی یہی حال ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے ضرورت بار بار دھرائی گئی ہیں لیکن حقیقت میں وہ ہر موقع پر ایک نئی مناسبت سے مذکور ہیں۔ سورہ مرسلات میں وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ کو تقریباً دس مرتبہ دھرایا گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ یہ بے سود تکرار ہے۔ لیکن استاذ امام علامہ فراہیؒ نے سورۃ مرسلات کی تفسیر میں دکھلایا ہے کہ یہ جملہ مختلف مواقع کی مناسبت سے کتنے کثیر معانی کا حامل ہے، اور کس بلاغت کے ساتھ قرآن مجید نے اسکو مختلف مناسبتوں سے اکثر مواقع پر استعمال کیا ہے۔ اسی طرح مولاناؒ نے تفسیر سورۃ رحمان غیر مطبوعہ میں فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ سے بھی بحث کی ہے اس لئے اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں سورہ مرسلات کی تفسیر چھپ چکی ہے، جو لوگ پوری تشفی چاہتے ہوں اس کا مطالعہ فرمائیں۔

ترجیعات کے علاوہ قصص کی تکرار لوگوں کیلئے مزید خلجان کا باعث ہے کیونکہ متعدد قصے ایسے ہیں جو بار بار بیان ہوئے ہیں۔ اسلئے اس مضمون میں قصوں کی تکرار پر ہم خاص طور سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن میں مختلف انبیاء کرام کے قصے اور گذشتہ قوموں کے حالات بکثرت بیان ہوئے ہیں، ان سے مقصود، تذکیر یا استدلال ہے۔ تذکیر اور استدلال کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ ایک ہی قصہ سے مختلف چیزوں پر استدلال ہو سکتا ہے اور ایک ہی واقعہ سے تذکیر کے مختلف فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے بعض مرتبہ ایک ہی قصہ بار بار مختلف اغراض کیلئے بیان کیا گیا۔ اگر ان کے سیاق و سباق کو پیش نظر رکھکر غور کیا جائے تو خود بخود واضح ہو جائیگا کہ ان کے ذکر کے کیا مقاصد ہیں۔ اگرچہ یہ ممکن ہے

اور اس میں کوئی عیب نہیں ہے کہ ایک قصہ ایک جگہ جس غرض کیلئے بیان کیا گیا ہے، دوسری جگہ بھی اسی غرض کیلئے بیان کیا جائے لیکن اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہر قصہ ہر جگہ ایک نئے فائدہ کے لئے مذکور ہے۔ اسی لئے آپ دیکھینگے کہ ایک قصہ جو مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے، ہر جگہ عبارت اور اسلوب میں دوسری جگہ سے بالکل جدا ہے۔ آدمؑ اور شیطان کا قصہ، قرآن میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ سات جگہ بیان ہوا ہے لیکن ہر جگہ استدلال کا پہلو الگ ہے اس لئے اسلوب و عبارت بھی ہر جگہ مختلف ہے۔ ایک ہی واقعہ سے مختلف جہات سے مختلف چیزوں پر استدلال کیا گیا ہے اور اس کے اعتبار سے اسلوب میں تبدیلی اور عبارت میں کمی یا زیادتی ہوگئی ہے کیونکہ مقتضائے حال کی رعایت، بلاغت کی جان ہے لیکن جو لوگ اس نکتہ کا لحاظ نہیں کرتے، ان کو یہ قصہ مکرر معلوم ہوتا ہے اور وہ اس تکرار کو بے سود سمجھتے ہیں۔ یہی حال دوسرے قصص کا ہے۔ مگر تلاوت قرآن کے سلسلہ میں بار بار زیادہ تر حضرت آدمؑ اور شیطان کا قصہ آتا ہے یا حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا اور چونکہ ان کا ذکر نسبتہً زیادہ بسط و تفصیل کے ساتھ آتا ہے اس لئے طبعاً ان کی تکرار ان لوگوں کو زیادہ کھٹکتی ہے جو ناواقفیت کی بنا پر ان کو مکرر خیال کرتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان کے ذکر کے مواقع اور مقاصد بیان کر دئے جائیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ قرآن میں وہ قصے بھی مکرر نہیں ہیں جو ایک مرتبہ نہیں بلکہ سات سات مرتبہ بیان ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور خاص فائدہ یہ ہوگا کہ جو لوگ قرآن میں ربط و تسلسل کے قائل نہ ہونیکی وجہ سے ان قصوں کو بے جوڑ خیال کرتے ہیں ان پر واضح ہو جائیگا کہ قصص قرآن میں کتنا گہرا نظم ملحوظ ہوتا ہے۔

ان قصوں پر دو پہلو سے غور کرنا ہے۔ ایک ان کے ذکر کے اغراض کو معین[1] کرنا ہے دوسرے ان کے اسالیب بیان کا اختلاف اور اس کے وجوہ دکھانے ہیں۔ پہلے حصہ سے یہاں بحث کی جاتی ہے اور دوسرے حصہ سے بشرط فرصت اخیر میں بحث ہوگی۔

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن کی حسب ذیل سات سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ بقرہ[۱]، اعراف[۲]، حجر[۳]، اسراء[۴]، کہف[۵]، طٰہٰ[۶]، ص[۷]۔

ترتیب قرآنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے سورہ بقرہ سے ابتدا کی جاتی ہے۔

قصہ آدمؑ و شیطان سورہ بقرہ میں

پہلے بطور مقدمہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہمارے نزدیک یہ مسلم ہے کہ مطالب آیات اور اغراض قصص کا تعین،

---

[1] اس مضمون میں مقاصد کی تعیین میں زیادہ تر استاذ امامؒ کے حاشیہ قرآن سے مدد لی گئی ہے۔ ۱۔ ث

نظم کلام سے ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آیات و قصص بظاہر مختلف معانی و اغراض کے حامل ہوں لیکن موقع و محل اور سیاق و سباق سے فیصلہ کرنا پڑیگا کہ آیتوں کا مفہوم اور قصوں کے ذکر کی غرض کیا ہے۔ لیکن اللہ کے معجزانہ کلام کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ بعض آیتیں اور بعض قصے بعض مقامات پر مختلف حیثیات کے جامع ہوتے ہیں اور آپ جس لحاظ سے دیکھتے ہیں وہ اپنی جگہ، انگشتری کے نگینہ کی طرح، موزوں اور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ کا بھی یہی حال ہے۔ مختلف پہلوؤں سے یہاں بیان ہوا ہے اور ماقبل سے مختلف حیثیتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں ہم ان میں سے صرف تین چار نمایاں وجوہ کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) ایک لطیف تعلق سمجھنے کے لئے، ماقبل کی ان آیتوں کو پیش نظر رکھیے:۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا	تم خدا کو کیسے نہیں مانتے۔ پہلے تم میں جان نہ تھی پھر تم میں
فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ	جان ڈالی پھر تم کو مار ڈالیگا پھر تم کو جلائیگا پھر تم کو اسی کے
إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ	پاس جانا ہے۔ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لئے سب کچھ جو زمین میں
مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ	ہے بنایا پھر آسمان کا ارادہ کیا اور سات آسمان بنائے اور
فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ	وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اسی کے بعد حضرت آدمؑ کی خلافت کا قصہ شروع ہوجاتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ ان آیتوں کو، اس قصہ خلافت سے کیا تعلق ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے ان آیتوں کا مفہوم اچھی طرح ذہن نشین کرلیجئے۔ استاذ امامؒ تفسیر سورہ بقرہ (غیر مطبوعہ) میں مذکورہ آیتوں کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "ان میں وجود خالق، وقوع قیامت، ابطال شرک اور وجوب اطاعت پر دلیل ہے"۔

یہ آیتیں کیونکر ان چیزوں پر دلالت کرتی ہیں؟ اس کو اپنے لفظوں میں عرض کرتا ہوں۔

پہلے ان جملوں کا، معانی کے اعتبار سے تجزیہ کیجئے پھر دیکھئے ہر جزء اپنے اندر ایک مستقل دلیل رکھتا ہے۔

(۱) (کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتا فاحیاکم)

یہ ٹکڑا وجود خالق پر کھلی ہوئی دلیل ہے۔ دنیا میں قدرت کے جو بے شمار آثار پائے جاتے ہیں، وہ اپنے موثر

کا خود پتہ دیتے ہیں پھر انسان کے لئے سب سے زیادہ قوی اور اقرب دلیل خود اس کی ذات ہے۔ تم کچھ نہیں تھے پھر تم کو کس نے پیدا کر دیا؟ اور پیدا کرنے کے بعد کس نے تمھیں بتدریج، حواس اور قوی دئے؟ اگر کوئی خالق نہیں ہے تو آخر تمہیں کون پیدا کرتا ہے؟ کون قوتیں دیتا ہے؟ اور کون حواس عطا کرتا ہے؟ کوئی بے جان چیز یہ سب کام انجام دے سکتی ہے؟۔

(۲) (ثم یمیتکم ثم یحییکم) یہ ٹکڑا اگرچہ ماقبل ہی سے متعلق ہے لیکن اس میں ضمناً معاد پر دلیل ہے (معاد پر یہاں ضمناً دلیل پیش کرنے کے وجوہ ہیں) اوپر وجود خالق پر یہ دلیل پیش کی کہ جو تم کو عدم سے وجود میں لاتا ہے وہی تمھارا خالق ہے اور پھر اسی سے معاد پر دلیل قائم کی کہ تم کچھ نہیں تھے مگر تم کو پیدا کر دیا تو مرنے کے بعد دوبارہ بھی وہ پیدا کر سکتا ہے۔ (ثم الیہ ترجعون) اس کے بعد کی آیتوں میں اپنی قدرت اور علم کو دکھایا ہے اس سے بھی دلیل معاد کی تائید ہوتی ہے۔

۳۔ (ھو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا الآیۃ)

یہ آیت ابطال شرک پر دو طریقوں سے دلیل ہے (۱) کائنات کی تمام چیزوں میں توافق اور مطابقت ہے۔ اس لئے ضرور اس کا خالق ایک ہے۔ (۲) جب خدا ہی نے زمین و آسمان کی تمام چیزیں ہمارے لئے پیدا کی ہیں تو یہ کتنی بڑی ناشکری ہے کہ ہم کسی کو اس کا شریک بنائیں۔

یہ تینوں باتیں الفاظ سے صراحتاً ثابت ہیں۔ ان کے ثابت ہونیکے بعد، انہی سے، اطاعت الٰہی کی فرضیت بھی ثابت ہوتی ہے۔ جب خدا ہمارے افعال سے واقف ہے اور ہم کو اس کے سامنے حاضر بھی ہونا ہے تو اس کی اطاعت کرنی چاہئے۔ وہ ہم پر ہر طرح مہربان ہے اور ہماری ہی راحت و آسائش کے لئے، دنیا کی تمام چیزیں پیدا کیں اور ہمارے لئے ہر قسم کا سامان فراہم کرتا رہتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اسکی شکر گذاری میں اس کی اطاعت کریں۔ اس کی اطاعت میں ہمارا نفع بھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، اس کے تمام احکام حکمت پر مبنی ہیں، اسلئے اس کی اطاعت اپنے ہی لئے سود مند ہے۔

Scanned by CamScanner

اس توضیح کے بعد اب یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ اللہ کے اعتقاد، اس کے انعامات کے اعتراف اور معاد کے یقین کا لازمی نتیجہ، جذبہ اطاعت ہے۔ جو خدا کے وجود کو تسلیم کریگا، اس کے انعامات کا دل سے اعتراف کریگا اور قیامت کا یقین رکھے گا وہ ضرور خدا کے حضور میں سرنیاز خم کریگا اور رضاء الٰہی کے طریقوں کو معلوم کرنا چاہیگا۔ یہیں سے نبوت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ مرضی الٰہی سے انبیاء کرام ہی آگاہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے اگلی آیتوں میں جب اطاعت خداوندی کا اثبات ہوگیا تو اس کے بعد، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کا قصہ بیان کیا۔ کیونکہ اس قصہ سے اس عمومی نبوت کا اثبات ہوتا ہے جس سے آنحضورؐ کی نبوت ثابت ہوتی ہے۔ اس قصہ میں عمومی نبوت پر ایک تو حضرت آدمؑ کی خلافت سے استدلال ہوتا ہے دوسرے اس عہد سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی اتباع سے متعلق، بنی آدم سے لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو خطاب کر کے کہا تھا:۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ	پس اگر میری ہدایت تم تک آئے تو اس پر چلنا۔ جو میری
فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ الخ	ہدایت پر چلیں گے ان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔

ہدایت کے آنے کے معنی، رسولوں کے آنے کے ہیں جیسا کہ سورۂ اعراف میں اسی قسم کے موقع پر ہے:۔

یَا بَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ الخ۔

ہدایت کے بجائے یہاں "رسل" کا لفظ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اس عہد کو یاد دلا کر آنحضور صلعم کی نبوت تسلیم کرنے کی دعوت دی ہے۔ اگلی آیتوں میں فرضیت اطاعت ثابت ہو چکنے کے بعد، اطاعت کے طریقوں کو بتلانے والے کی رسالت کا اثبات ضروری تھا۔

(۲) اس قصہ سے پہلے، اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کے ذکر کے سلسلہ میں انسان کے پیدا کرنے اور زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اسی کے لئے بنانے کو بیان کیا ہے، لیکن انسان، زمین و آسمان کی تمام نعمتوں سے اسی وقت متمتع ہو سکتا ہے جب ان پر کوئی حاکم ہو جو ان کے اندر امن و نظام قائم کر سکے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان انعامات کو بیان کرنے کے بعد حضرت آدمؑ کی خلافت کو بیان کیا جس سے خلافت کی اصل و ابتدا اور اسکی ضرورت پر روشنی پڑتی ہے۔

Scanned by CamScanner

(۳) یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کا قصہ، انسان پر اپنے بے شمار انعامات کے واضح کرنیکے لئے بیان کیا ہے، اس قصہ سے پہلے ابطال شرک پر یہ دلیل پیش کی تھی کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں، خدا ہی نے تمھارے لئے پیدا کی ہیں، پس یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر غیر اللہ کی پرستش کرو۔ اس کے بعد اپنی مزید عنایت و رحمت بلکہ ان انعاموں سے بڑھکر انعام کو بیان کرنے کے لئے، حضرت آدمؑ کی خلافت اور ملائکہ کے سجدہ کا حال بیان کیا کہ ہم نے صرف یہی نہیں کہ زمین و آسمان کی چیزیں تمھارے لئے پیدا کیں، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ تم کو زمین میں اپنی خلافت عطا کی اور تم کو فرشتوں کا مسجود بنایا۔ اتنی بڑی بڑی نعمتوں کے بعد بھی شرک کرنا، انتہائی بدبختی ہے۔ اس قصہ سے قبل انعامات ہی کا بیان تھا، اسی سلسلہ میں اس بڑے انعام کو بیان کیا۔

(۴) یہ طے شدہ ہے کہ سورہ بقرہ کا موضوع آنحضور صلعم کی رسالت کا اثبات ہے۔ خصوصاً یہود کے لئے۔ اسی لئے اس قصہ کے بعد ہی سے مستقلاً خطاب "یَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ" کے ساتھ دور تک چلا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے خطاب سے قبل ایک خاص تعلق سے یہ قصہ بیان کیا اور حسب دستور اس قصہ میں وہ باتیں بیان کیں جو آئندہ بنی اسرائیل سے مستقل خطاب کے لئے تمہید کا کام دیں۔ حقیقت میں یہ قصہ بنی اسرائیل کے ماضی و مستقبل کا آئینہ ہے۔ جس طرح شیطان نے غرور کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کے سجدہ سے انکار کیا، اسی طرح بنی اسرائیل، آنحضور کو پہنچاننے کے بعد بھی آپ کی نبوت کا انکار کرتے رہے۔ ان کے انکار کی وجہ زیادہ تر خاندانی غرور تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہی خدا کے چہیتے ہیں اور اب تک نبوت، انہی کے خاندان میں رہی ہے۔ اس لئے اب ایک اسماعیلی پیغمبر کی اطاعت کا ننگ کیسے گوارا کریں۔ اکثر جگہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال کو نقل کرکے اس کا جواب دیا ہے کہ نبوت ہمارا عطیہ ہے، ہم جسے چاہیں بخش دیں۔ اس میں تمہارا کوئی اجارہ نہیں۔ شیطان کا واقعہ بنی اسرائیل کے لئے ایک عبرت ہے۔ اس قصہ میں حضرت آدمؑ کے عہد توڑنے اور پھر اس کے انجام کا حال بیان ہوا ہے یہ بنی اسرائیل کیلئے تنبیہ ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے بھی آنحضور صلعم کی نبوت کا انکار کرکے اپنے عہد پر قائم نہ رہے تھے۔ اور حضرت آدمؑ کی توبہ کا ذکر، بنی اسرائیل کیلئے توبہ کی تذکیر ہے۔

(باقی)

مذاکرہ

سورۂ ہود کے متعلق ایک اہم سوال کا جواب

از جناب مولوی ابواللیث شیر محمد صاحب اصلاحی ندوی

بعض حدیثوں میں سورۂ ہود کے متعلق وارد ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا "شیبتنی ہود" مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ ایک عزیز دوست نے کچھ دن ہوئے مجھ سے اس روایت کے متعلق علماء محققین خصوصاً علامہ فراہیؒ کا نقطۂ نظر دریافت کیا تھا۔ اس وقت جواب میں چند صفحات لکھے گئے لیکن ان کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اب فائدہ عام کے خیال سے شایع کئے جاتے ہیں۔ (ا۔ ش)

یہ روایت، حدیث کی کتابوں میں متعدد طریقوں سے منقول ہے۔ بعض روایتوں میں "شیبتنی ہود" کے بعد "واخواتہا" کا لفظ بھی ہے اور مختلف روایتوں میں اس کی تفصیل مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔ کہیں اخواتہا کے ضمن میں سورۂ واقعہ، قارعہ، حاقہ، تکویر اور معارج کو بیان کیا گیا ہے اور کہیں مرسلات، سورۂ نبا اور سورۂ تکویر کو۔ یہ اختلاف انہی دو روایتوں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ متعدد دوسری روایتوں میں بعض سورتوں کی جگہ، دوسری سورتوں کے نام لئے گئے ہیں لیکن اگر ان تمام سورتوں کو جمع کر کے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اخواتہا" کی تفصیل میں جتنی سورتیں مذکور ہیں وہ تمام تر وہ ہیں جن میں قیامت کے احوال بیان ہوئے ہیں۔ ان تمام سورتوں میں قیامت کا ذکر، عمود کی حیثیت سے آیا ہے اور اسکا اس طرح نقشہ کھینچا گیا ہے کہ پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ہر شخص جو ان سورتوں کو حضورِ قلب اور نیتِ صالح کے ساتھ پڑھتا ہے، ان کو پڑھ کر کانپ اٹھتا ہے۔ پڑھنے والے کی طبیعت جتنی زیادہ حساس اور مآل اندیش ہوتی ہے، اتنی ہی زیادہ اس کے اندر دنیا سے بیزاری و نفرت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی لذتیں سوہانِ روح بن جاتی ہیں۔ عاقبت کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے کہ معلوم نہیں مرنے کے بعد کیا حشر ہوگا؟۔

یہ اثر حسب استعداد کم و بیش تمام پڑھنے والوں پر پڑتا ہے پھر خیال کیجئے کہ جو ہستی صرف اپنی ہی نجات کی فکرمند نہیں ہے بلکہ پوری امت اور سارے عالم کی غم گسار ہے، اس پر ذکر قیامت کیا قیامت ڈھائے گا! رحمتِ عالم کی شانِ رحمت دیکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ یہ سورتیں آپ کے قبل از وقت بڑھاپے کا سبب بن گئیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ ہود میں تو بظاہر قیامت کا ذکر بھی نہیں۔ پھر آخر اس میں ایسی کیا چیز ہے جس کی ذمہ داری اور مسئولیت کے غم نے آپ کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا؟ سورۂ ہود کے متعلق یہ سوال ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے۔ حدیث کی بعض کتابوں میں ہے کہ ایک بزرگ کو خواب میں آنحضور صلعم کی زیارت نصیب ہوئی۔ انھوں نے اس عقدہ کو آپ سے حل کرنا چاہا اور استفسار کیا کہ سورہ ہود کی کس بات نے آپ کو بوڑھا بنا دیا؟ انبیاء کے قصوں نے؟ قوموں کی ہلاکت کے واقعات نے؟ یا کسی اور چیز نے؟ آپ نے فرمایا آیت "فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ" نے۔

لیکن میرے نزدیک یہ سوال، لوگوں کے دلوں میں، اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف ذکر قیامت ہی کو غم کا باعث فرض کر لیا ہے۔ اس لئے جب سورہ ہود میں قیامت کا ذکر کسی خاص اہمیت کے ساتھ نہیں پاتے تو ان کو تعجب ہوتا ہے کہ اس سورہ کو "شیب" کا باعث کیوں کہا گیا ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف ذکر قیامت ہی، آنحضور صلعم کے حزن و ملال کا باعث نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ اور دوسرے اسباب بھی تھے۔ اکثر روایتیں ان اسباب کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے۔

شیبتنی هود واخواتها وذکر یوم القیامة وقصص الامم	مجھے ہود، اس کی امثال، ذکر قیامت اور قوموں کے قصوں نے بوڑھا بنا دیا۔

دوسری روایت میں ہے۔

شیبتنی هود واخواتها وما فعل بالامم قبلي	مجھے ہود، اس کی امثال اور ان حالات نے جو میری امت سے پہلی قوموں کو پیش آئے بوڑھا بنا دیا۔

ان روایتوں سے واضح ہوتا ہے کہ صرف ذکر قیامت ہی غم کا باعث نہ تھا بلکہ اس کے اسباب متعدد تھے،

Scanned by CamScanner

جن میں قصص الامم یا ما فعل بالامم قبلی بھی شامل ہے۔ لیکن آنحضور صلعم نے صرف چند اسباب کی طرف اشارہ کیا کیونکہ اخوار، مقصود نہ تھا۔ اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ اگرچہ ذکر قیامت کو آپ نے شیب کا باعث قرار دیا ہے، لیکن ان کثیر سورتوں میں سے، جن میں قیامت کا بیان خاص طریقہ سے ہوا ہے، صرف چند سورتوں کا آپ نے نام لیا اور کبھی کسی سورہ کا کبھی کسی سورہ کا۔ کیونکہ مقصود ان کا تعین نہ تھا بلکہ یہ واضح کرنا تھا کہ آپ کے بڑھاپے میں قیامت والی سورتوں کو بھی دخل ہے۔

الغرض شیب کے اسباب گوناگوں تھے، لیکن راویوں نے سمجھا کہ سورہ ہود، واقعہ اور دوسری سورتیں جن کو آپ نے بیان فرمایا ہے، سب ایک ہی حیثیت سے بڑھاپے کا باعث بنیں۔ اس لئے وہ ان سورتوں کو "اخواتہا" کہہ کر ذکر کرتے ہیں جس کی وجہ سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ پر یہ سب سورتیں ایک ہی نہج سے اثر انداز ہوئی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ اوپر میں نے بیان کیا۔ اس خیال کی تائید یوں بھی ہوتی ہے کہ زیادہ صحیح روایتوں میں یا تو "اخواتہا" کا لفظ سرے سے آتا ہی نہیں جیسا کہ ترمذی وغیرہ میں ہے کہ شیبتنی ہود والواقعہ والمرسلات وعم یتسائلون واذا الشمس کورت۔ یا واخواتہا کے بعد واؤ عاطفہ کے ساتھ سورتیں گنائی جاتی ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ ہود واخواتہا کی نوعیت دوسری ہے اور ان سورتوں کی دوسری۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورہ ہود کس نہج سے شیب کا باعث ہوئی؟ افسوس ہے کہ اس سوال کی طرف عموماً علماء نے بہت کم توجہ کی ہے البتہ حسب توقع امام رازیؒ نے اس پر طویل بحث کی ہے۔ امام غزالیؒ نے بھی اپنی کتاب احیاء العلوم میں ایک جگہ محبت الٰہی کے بیان میں ضمناً اس روایت سے تعرض کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "جس طرح جمال کے ادراک سے قلب میں محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح محبوب کی عظمت کا احساس ہیبت کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نہیں خیال کرنا چاہئے کہ محبت و ہیبت کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ عاشقان الٰہی گو اس کی محبت میں سرشار ہوں لیکن ان کو ہر وقت اس کے اعراض اور بے نیازی کا ڈر لگا رہتا ہے اور جو قرب و وصال کی لذتوں سے پوری طرح متمتع ہو چکے ہوں، ان کے لئے تو ہجر و فراق کا ذکر ہی قیامت ہے۔ سورہ ہود میں بہت سی قوموں کی ہلاکت اور بربادی کا بیان ہے۔ گو یہ قومیں اپنی سرکشی اور شرارت کی بنا پر ہلاک و برباد

ہوئیں۔ لیکن جس کا دل عظمتِ الٰہی اور جلالِ خداوندی کے تصور سے لبریز ہو، وہ اغیار کے انجام بد کو بھی دیکھ کر اپنی جگہ پر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے الابعد اً لثمود، الابعد اً لمدین وغیرہ جیسے زواجر نے آپ کو لرزا دیا اور آپ اس فکر میں جلد بوڑھے ہو گئے۔"

امام غزالیؒ کی یہ تقریر بہت لطیف ہے لیکن ان کی توجیہ صحیح نہیں، کیونکہ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے تصریح فرمائی کہ مجھے آیت "فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ" نے بوڑھا بنا دیا۔ حضرت ابن عباس بھی اسی بات کے قائل ہیں۔ امام رازیؒ بھی اسی آیت کو شیب کا باعث قرار دیتے ہیں لیکن جس نہج سے وہ قرار دیتے ہیں، اس سے ہمیں اتفاق نہیں۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ "اس آیت میں آنحضور صلعم کو حقیقی مامور بہا عقائد اور مامور بہا اعمال پر استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ چیز بہت دشوار ہے۔ عقائد میں اولین درجہ معرفتِ الٰہی کا ہے۔ لیکن بندہ کو صحیح معرفت کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یا تو صفات کثیرہ کا اثبات کرتے کرتے خدا کو انسان بنا دے گا یا تمام صفات سے اس کو معرا کر دے گا اور اگر یہ صحیح معرفت اس کو حاصل بھی ہوئی تو اس پر استقامت بہت زیادہ دشوار ہے۔ یہ حال تو عقائد کا ہے۔ رہی اعمال کی صحیح پابندی اور اس پر استقامت تو ظاہر ہے یہ اس سے بھی بدرجہا دشوار ہے۔ اسی لئے آنحضرت پر یہ آیت ایک بارگراں تھی جس کی فکر نے آپ کو بوڑھا کر دیا۔"

افسوس ہے کہ بوجوہ جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، امام رازی کی اس توجیہ سے ہم کو اختلاف ہے۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسی مفہوم کی ایک آیت بلکہ بعینہ یہی آیت سورۂ شوریٰ میں بھی وارد ہوئی ہے۔ (ملاحظہ ہو آیت ۱۵) استقامت کا حکم جس طرح یہاں ہے ٹھیک اسی طرح وہاں بھی ہے۔ اگر یہی حکم آپ کے بڑھاپے کا باعث ہوا تو پھر سورۂ ہود کی تخصیص کے کوئی معنی نہیں۔ پس یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ یہ آیت آپ پر قرآن کی تمام آیتوں سے زیادہ بار تھی جس کی بنا پر آپ نے "شیبتنی ہود" فرمایا۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ قول بالکل آخر عمر کا ہے اور یہ دونوں سورتیں مکی ہیں اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ سورۂ شوریٰ اس قول کے بعد نازل ہوئی۔ پھر یہ بات ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ آپ پر استقامت کا حکم اس حیثیت سے جس حیثیت سے امام رازی فرماتے ہیں، کیوں اتنا بار گذرا کہ اس کے غم میں

آپ پر جلد بڑھاپے کے آثار طاری ہو گئے! کیا واقعی یہ آیت آپ پر اسی لئے بار تھی کہ اس میں ایک ناممکن الحصول چیز کا حکم دیا گیا ہے! اگر ایسا ہے تو انسان ناممکن چیز کا مکلف ہی کب بنایا گیا ہے۔ کیا قرآن کی متعدد آیتوں میں یہ تشریح نہیں کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا! کیا نعوذ باللہ آپ اس بات سے بے خبر تھے؟ بہرحال بوجوہ ہم کو امام رازی کا یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اب ہم آخر میں اس مسئلہ کے متعلق استاذ امام علامہ فراہیؒ کا نقطۂ نظر واضح کرنا چاہتے ہیں۔

مولانا بھی حضرت ابن عباس کے قول کے مطابق، آیت فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ کو شیب کا باعث قرار دیتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضور صلعم کے لئے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت اور کوئی آیت نہ تھی لیکن مولانا کی توجیہ امام رازی کی توجیہ سے بالکل مختلف ہے۔ مولانا کے نزدیک یہ آیت اس حیثیت سے شیب کی باعث نہیں ہے کہ اس میں ایک محال اور غیر ممکن الحصول چیز کا حکم ہے بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس میں اور بعد کی آیتوں میں ان خرابیوں کی طرف اشارہ ہے، جن میں مسلمان مبتلا ہو کر دین و دنیا کو کھو بیٹھیں گے اسی کا غم تھا جس نے رحمتِ عالم کو قبل از وقت بوڑھا بنا دیا لیکن یہ اشارہ اتنا صریح نہیں ہے کہ ہر شخص آسانی سے سمجھ لے۔ اس کے سمجھنے کے لئے ذوقِ سلیم کے ساتھ، قرآن کے اسلوب بیان وغیرہ پر بہت گہری نظر ہونی چاہئے۔ بہت سی آیتیں ایسی ہیں جن میں عوام کو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن غور و تدبر کرنے والے علماء انہی آیتوں سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں۔ پیشینگوئیوں اور اشاروں کا سمجھنا تو اور زیادہ دشوار ہے۔ سورۂ والنصر میں آنحضور صلعم کی وفات کی پیشینگوئی تھی، لیکن خاص خاص صحابہ کے سوا عموماً لوگ اس کو نہیں سمجھے کیونکہ ظاہر الفاظ سے اس کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا۔ اس آیت میں بھی بظاہر کوئی صریح اشارہ ہم کو نظر نہیں آتا لیکن اگر ان تمام مقدمات کو سامنے رکھا جائے، جن کی بنا پر مولاناؒ اس رائے تک پہنچے تھے۔ تو پھر اس میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن افسوس ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق ہمارے سامنے صرف مولاناؒ کا دعویٰ ہے، ان کے وجوہ و دلائل کی تفصیل، بجز چند مجمل اشارات کے، ہمارے سامنے نہیں ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس دعویٰ پر مولانا کے پاس کیا دلائل تھے۔

البتہ جن قرائن سے ہم اس دعویٰ کو صحیح خیال کرتے ہیں، ان کو یہاں بیان کرتے ہیں۔

آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ نے بہت تفصیل کے ساتھ پہلے ان قوموں کی دنیاوی ہلاکت اور اخروی عذاب و خسران کو بیان کیا جو نشۂ دولت سے سرشار ہو کر عالم میں فتنہ و فساد پھیلا رہی تھیں اور اپنی ثروت کے غرور میں رسولوں کو جھٹلاتی تھیں اور اللہ کے بندوں کو ایذائیں پہنچاتی تھیں اور آخر میں مشرکین عرب کی ہلاکت کی بشارت سناتے ہوئے اس بیان کو اس آیت پر ختم کر دیا۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ	سو تو نہ رہ دھوکے میں ان چیزوں سے جن کو پوجتے ہیں یہ لوگ
إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُم مِّن قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ	کچھ نہیں پوجتے مگر ویسا ہی جیسا کہ پوجتے تھے ان کے باپ دادا
نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ۝	اس سے پہلے۔ اور ہم دینے والے ہیں انکو ان کا حصہ یعنی عذاب بلا نقصان

اس کے بعد اہل کتاب کے اختلاف کو بالاختصار بیان کر کے آنحضور صلعم اور مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ	سو تو سیدھا چلا جا جیسا تم کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے
وَلَا تَطْغَوْا	ساتھ اور حد سے نہ بڑھو۔

یہ خطاب یہاں خاص اہمیت رکھتا ہے اور درحقیقت اس آیت میں ایک لمبی داستان پنہاں ہے۔ حرف فا سے اس جملہ کی ابتدا ہوئی جس کا اقتضا یہ ہے کہ اس کا تعلق ماقبل سے ہے۔ سو نظم کلام کو پیش نظر رکھنے والوں پر ظاہر ہے کہ یہاں مسلمانوں کے لئے یہ بشارت ہے کہ اب ان کو خدا کی فتح و نصرت نصیب ہونے والی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ گذشتہ قوموں کی طرح، مال و دولت پا کر مسلمان بھی اپنے کو طغیان اور اختلاف کی وبا سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ اسی لئے فاستقم کما امرت کے بعد ولا تطغوا کہا گیا۔ پس اس میں ایک طرف بشارت ہے اور دوسری طرف سرکشی اور اختلاف میں پڑنے کی پیشینگوئی۔ ان دونوں مسئلوں کو سمجھنے کے لئے متعدد طویل مقدمات کی ضرورت ہے۔ بشارت کے پہلو کو سمجھنے کے لئے دو باتیں پیش نظر رکھئے۔

۱۔ قرآن میں امر کے بعد جب نہی آتی ہے تو اس نہی سے امر کے مفہوم کی توضیح و تشریح ہوتی ہے۔ اس کی مثالیں

قرآن میں کثرت سے ملیں گی۔ پس فاستقم کما امرت کے بعد جو لاتطغوا فرمایا تو گویا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ مال و دولت کے حصول کے بعد جس طرح گذشتہ قومیں طغیان میں مبتلا ہو گئی تھیں کہیں تم بھی طغیان میں مبتلا نہ ہو جانا، بلکہ جادۂ حق پر مستقیم رہنا۔

۲۔ بشارت کا ایک لطیف پیرایۂ بیان یہ ہے کہ جس چیز کی بشارت دینی مقصود ہے اس کا ذکر نہ کیا جائے بلکہ اس کے لوازم کو نفیاً یا اثباتاً بیان کر دیا جائے۔ اس سے ملزوم کی بشارت خود بخود سمجھ لیجائے گی غور کیجئے، تسلی کا موقع ہے سرکش قوموں کی ہلاکت کا طویل بیان تسلی ہی پر ختم ہوا ہے اور بعد کی آیت میں بھی ایک گونہ تسلی ہی ہے۔ اسی کے بعد حرف فا کے ساتھ آیت فاستقم کما امرت الآیۃ کی ابتدا کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں مقصود ان قوموں کے تکبر و نشۂ دولت کے انجام بد کو دکھلا کر مسلمانوں کو استقامت کا حکم دینا ہے اور طغیان سے روکنا ہے جو لازمۂ دولت و ثروت ہے۔ تو کیا اس طغیان کی نہی سے یہ نہیں سمجھا جائیگا کہ اب مسلمانوں کو وہ چیز ملنے والی ہے جسکا لازمی نتیجہ طغیان ہے اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہاں لاتطغوا کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل واضح ہے کہ طغیان کا جذبہ، مال و دولت کی فراوانی ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیتوں میں اس کی تصریح ہے۔ مثلاً اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی۔

پس جب طغیان کی نہی کی گئی جو لازمۂ استغنا ہے تو اس سے خود ظاہر ہو گیا کہ مسلمانوں کو اب استغنا نصیب ہونے والا ہے۔

پیشینگوئی کے لئے، جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا، کوئی صریح اشارہ یہاں پایا نہیں جاتا لیکن گذشتہ قوموں کے اختلاف و طغیان کو ذکر کرنے کے معاً بعد، استقامت کے حکم اور طغیان کی نہی سے حقیقت سنج دماغ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ امر و نہی یہاں کوئی خاص اہمیت رکھتے ہیں اور پھر دو تین آیتوں کے بعد جو نسخۂ شفا تجویز کیا گیا ہے اس سے تو اہل نظر مرض کے وجود اور اس کی نوعیت کا اندازہ بخوبی لگا لیتے ہیں۔ چنانچہ انہی دو آیتوں کے بعد جن میں طغیان اور اختلاف میں پڑنے کا اشارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ و صبر کا حکم دیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں دراصل سابق الذکر بیماریوں کی دوا ہیں طغیان اور اختلاف کے پیدا ہونے کے اسباب و وجوہ پر اگر آپ کی نظر ہو تو آپ بخوبی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ نماز کیوں کر ان اسباب کا بیخ و بن کے ساتھ خاتمہ کرتی ہے۔ مال و دولت کی فراوانی کے بعد انسان کے دل و دماغ پر ایک نشہ سوار

ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے کو اللہ سے اور لوگوں سے بے نیاز سمجھنے لگتا ہے، اس لئے وہ نہ تو اللہ کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا اور نہ کسی بات میں لوگوں کی پروا کرتا ہے۔ جب کسی قوم کے افراد کی حالت اس حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ شکست و نامرادی سے دوچار ہوتی ہے اور اللہ کی رحمت سے محروم ہوکر برباد ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ یہاں کہا گیا ہے ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ پھر جب تک یہ قوم اللہ کی طرف رجوع نہیں کرتی ہلاکت سے بچ نہیں سکتی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس سے بچنے کے لئے نماز کا حکم دیا کیونکہ نماز ہی رحمت کا سبب ہے، یہی رجوع الی اللہ کی نشانی ہے، اسی سے مال و دولت کا نشہ زائل ہوتا ہے اور اسی سے انسان کے دل و دماغ کی ہر کل درست ہوتی ہے، جیسا کہ مختلف آیات میں کہا گیا ہے۔ ایک جگہ ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا	انسان چھوٹے دل کا ہے۔ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے
وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ	گھبرانے لگتا ہے اور جب نعمت مل جاتی ہے بخیل بن جاتا ہے مگر وہ
هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝	جو نمازی ہیں اور اپنی نمازوں کو کبھی ناغہ نہیں کرتے۔

ان اشارات کے علاوہ بعد کی آیتوں میں اور بھی اشارے پائے جاتے ہیں، لیکن یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ فراہیؒ کے نزدیک سورۂ ہود اس حیثیت سے شیب کا باعث ہوئی کہ اس میں ان خرابیوں کی طرف اشارہ تھا جو مسلمانوں میں آئندہ پیدا ہوں گی۔ آنحضرت صلعم کو اپنی امت کے ساتھ جو محبت تھی اس کو دیکھتے ہوئے کچھ تعجب نہیں کہ آپ ان خرابیوں کے تصور سے جلد بوڑھے ہوجائیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو کہ اگر ان آیات میں پیشنگوئی ہے تو یہی پیشنگوئی سورۂ شوریٰ میں بھی ہونی چاہئے، جہاں بعینہٖ یہی آیت موجود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مفہوم آیات کی تعیین کا ذریعہ سیاق و سباق اور نظم کلام ہے۔ یہاں الفاظ اور نظم کلام سے اس پیشنگوئی کی طرف اشارہ ہوتا ہے، لیکن سورۂ شوریٰ میں یہ آیت ایک دوسرے موقع پر ہے، اسی لئے وہاں استقامت کے حکم کے بعد لاتطغوا کہنے کے بجائے ولاتتبع اہوائہم کہا گیا۔ اس نہی سے اس آیت کا مفہوم متعین ہوگا، جیسا کہ میں پہلے قاعدہ عرض کرچکا ہوں۔

Scanned by CamScanner

موعظت حسنہ

نماز

۳

ازامین احسن اصلاحی

نماز قوموں کی عدالت ہے! اس مقام تک پہنچنے کے بعد، یہ سمجھنے کی راہ باز ہوگئی کہ نماز قوموں کی عدالت ہے، یعنی قوموں کا عزل و نصب نماز ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جو قوم نماز قائم کریگی، فلاح پائیگی۔ جو نماز سے غفلت کریگی، تباہ ہوجائیگی۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن پچھلے مباحث، اگر نظر کے سامنے ہوں تو نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

اوپر پڑھ چکے ہو کہ نماز تمام کائنات کی فطرت ہے، اس لئے جو شخص نماز سے اعراض کرتا ہے، وہ گویا تمام کائنات سے اعلان جنگ کرتا ہے۔ وہ سورج اور ہوا سے لڑتا ہے۔ آسمان و زمین سے بغاوت کرتا ہے۔ اور اس پوری کائنات میں جو توافق اور ہم آہنگی (ہارمونی) ہے، اس کو درہم برہم کرکے، اپنی ایک الگ راہ نکالنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ سازِ ہستی سے جو نغمہ بلند ہو رہا ہے، اس میں اپنی آواز ملاکر، اس کو بلند تر کردے، بلکہ اپنے تنہا آہنگ سے ایک الگ نغمہ ترکیب دینا چاہتا ہے۔ وہ سمندر بنکر نہیں، قطرہ بنکر جینا چاہتا ہے۔ کیا ایسا وجود فلاح پائیگا؟ اگر شاخ تنہ سے الگ ہوکر خشک ہوجاتی ہے اور گلہ سے الگ ہوجانے والی بھیڑ کو بھیڑیا کھاجاتا ہے تو اس وجود کے خسران میں کیوں شبہہ ہو، جو چمن میں نہیں ہے، بلکہ بیابان کے درخت کی طرح اکیلا ہے اور زندگی و بقا کے تمام وسائل سے محروم! سورہ حج والی آیت، جو اوپر گذر چکی ہے، ایک مرتبہ پھر غور سے پڑھو۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لئے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہو
وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ	زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور

وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ

درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی لیکن بہتیرے ایسے بھی ہیں جو اس سے منحرف ہیں اور ان کیلئے اللہ کا وعدۂ عذاب حق

اس آیت کے آئینہ میں، تمام کائنات خدا کے سامنے سربسجود نظر آتی ہے۔ سورج اور چاند، دریا اور پہاڑ، شجر و حجر، چرند و پرند سب اس کے عرش عزت و جلال کے آگے سرنگندہ ہیں۔ ایک وجود بھی اس سے منحرف نہیں۔ تمام مخلوقات الٰہی کی زبانوں پر ایک ہی کا ترانہ اور ایک ہی کی حمد ہے۔ انسانوں میں سے جنکی فطرت صالح ہے، وہ بھی اس بزم میں شریک ہیں۔ (وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ) سورج جب خدا کے سامنے سر جھکا دیتا ہے، وہ بھی اس کے حضور صفین باندھکر سجدوں میں گر جاتے ہیں (اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ) ستارے جب اپنے خالق کے سامنے سرنگندہ ہوتے ہیں، وہ بھی اپنے بستروں سے اٹھکر، اپنی جبین نیاز اس کے سامنے رکھدیتے ہیں (وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ) اور چونکہ انسان ذی ارادہ اور تمام کائنات سے اشرف و اعلیٰ مخلوق ہے اس لئے جب چاہتا ہے، حمد الٰہی کا نغمہ اس وجہ سے چھیڑتا ہے کہ اگر زمین کے غافل انسان اس کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ قضا کی چڑیوں کو شریک بزم کرلیتا ہے اور اگر سنگدل آدمیوں کو اس کی رفاقت سے انکار ہوتا ہے تو وہ پہاڑوں کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ کیونکہ خدا کی تمام مخلوقات میں انسان کے سوا اسکی حمد و تسبیح سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗ اَوَّابٌ

اور ہم نے اس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کردیا وہ شام کو اور چاشت کے وقت اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے اور چڑیاں جھنڈ کی جھنڈ اور سب چیزیں خدا کی طرف رجوع کرنیوالی ہیں۔ (۱۹ ص)

یہی انسان کامیاب ہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ان ایمان والوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازوں میں عاجزی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں، تمام کائنات سے کٹ کر نہیں رہنا چاہتے بلکہ گھرانے کے ایک فرد اور مجموعۂ کائنات کے ایک عضو کی طرح جینا چاہتے ہیں۔ وہ اس کل کے ایک جزء اور اس سمندر کے ایک قطرہ ہیں اس لئے زمین اور آسمان دونوں کو ان سے محبت ہوتی ہے۔

کائنات کی ایک ایک چیز ان کو پیار کرتی ہے۔ زمین ان کے لئے غلہ اگاتی ہے، بادل ان کے لئے پانی برساتے ہیں۔ ہوائیں ان کی فصلیں پکاتی ہیں، سورج ان کو گرمی پہنچاتا ہے، چاند ان کو شمع دکھاتا ہے، ستارے ان کی رہبری کرتے ہیں۔ وہ تمام کائنات سے محبت کرتے ہیں اس لئے تمام کائنات ان سے محبت کرتی ہے۔ وہ خدا کو محبوب ہو جاتے ہیں اس لئے خدا اپنی تمام مخلوق کو حکم فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرے۔ اسی لئے فرمایا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ	اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے ہم ان کے
سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ	گناہوں کو جھاڑ دیتے اور ان کو جنت نعیم میں داخل کرتے
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	اور اگر وہ لوگ توراۃ و انجیل کو قایم کرتے اور اس چیز کو جو انکی
وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ	طرف ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی ہے تو وہ آسمان
فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۶۷-۶۸ مائدہ)	و زمین دونوں کی برکتوں سے متمتع ہوتے۔

ممکن ہے کسی کو شبہہ ہو کہ یہاں زمین و آسمان کی نعمتوں کے فتح باب کو اللہ تعالی نے اقامت تورات و انجیل کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ نماز کا کوئی ذکر نہیں ہے اور ہماری بحث کا تعلق نتائج و برکات نماز سے ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اقامت کتاب یا اقامت تورات و انجیل یا اس سے زیادہ وسیع لفظوں میں، اقامت شریعت کا انحصار اقامت نماز ہی پر ہے۔ کتاب الٰہی کے اداشناس جانتے ہیں کہ اگر یہاں اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ کی جگہ صرف اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ہی کا لفظ ہوتا تو گو الفاظ بدل جاتے لیکن حقیقت میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔ اس بحث کو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اقتضائے مقام سے چند اشارات ضروری ہیں۔ سورہ اعراف (آیۃ ۱۶۹) میں ہے

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قایم کرتے ہیں۔
اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ۔	بیشک ہم اصلاح کرنیوالوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتے

اس آیت میں تمسک بالکتاب کی علامت صرف اقامت نماز کو قرار دیا ہے۔ یعنی جو جماعت نماز پر صحیح طور سے قایم ہے وہ اپنی کتاب پر قائم ہے۔ اس کا اجر ضائع نہ ہوگا۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اضاعت صلاۃ کو تمام شریعت

کے ہدم وتخریب کے مفہوم میں استعمال کیا۔ (اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ) اور دور کیوں جائیے، خود سورہ مائدہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اس عہد کا ذکر فرمایا ہے جو یہود سے پابندی شریعت کے متعلق لیا گیا ہے، وہاں کتاب یا تورات کا لفظ نہیں رکھا بلکہ نماز کا لفظ رکھا۔ اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نماز کے کمزور ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ تمام عہد و میثاق کی گرہ ڈھیلی ہو گئی۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَاۗءِیْلَ وَ	اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں بارہ نقیب
بَعَثْنَا مِنْھُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا وَقَالَ اللّٰہُ	اٹھائے اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم
اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ (۱۲- مائدہ)	کروگے اور زکوٰۃ دیتے رہوگے۔

تاہم اگر ان تصریحات کے بعد بھی کسی کو پورا اطمینان نہ ہو تو سورہ اعراف کی یہ آیت نماز کے نتائج کے باب میں بالکل غیر مشتبہ ہو۔

قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا	موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو اور ثابت قدم
اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا مَنْ یَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِہٖ	رہو۔ بیشک زمین اللہ کی ملکیت ہے وہ اپنے بندوں میں سے
وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ (۱۲۸ اعراف)	جسکو چاہیگا بخشے گا۔ اور انجام کار کی کامیابی پرہیزگاروں کیلئے ہے۔

یہ آیت بعینہٖ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ کے ہم معنی ہے اس میں اللہ کا لفظ ہے اس میں صلوٰۃ کا لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، ان دونوں لفظوں سے ایک ہی حقیقت تعبیر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ نماز ہے پس ایک آیت میں ذریعہ کو بتا دیا دوسری میں مقصود کو۔

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ جو جماعت نماز قائم کرتی ہے وہ تمام کائنات کے ساتھ متحد اور ہم آہنگ ہو جاتی ہے اس کائنات کا ذرہ ذرہ اسکا ساتھی اور رفیق ہے۔ زمین اور آسمان اور ان کے مابین جو کچھ ہے، سب کے ساتھ اسکا رشتہ قائم ہے اور چونکہ اس پورے گھرانے میں ارادہ و اختیار کی مخلوق تنہا وہی ہے اس لئے اسکی سیاست کی باگ اسی کے ہاتھوں میں دیدی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے جو جماعت نماز سے اعراض کر لیتی ہے، وہ تمام کائنات سے اپنا رشتہ کاٹ لیتی ہے۔

Scanned by CamScanner

زمین و آسمان کے ساتھ اس کا اتحاد باقی نہیں رہ جاتا پس قدرت کے قانون کے مطابق زمین سے اس کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے کیونکہ وہ کنبہ کے تعاون سے محروم ہو چکی ہے جو زندگی اور بقا کے لئے ناگزیر ہے۔

اس مقام پر ایک لمحہ توقف کر کے اس حقیقت کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ افراد و اقوام کو جو کچھ بخشتا ہے، انکی صلاحیت اور استعداد کے پیمانہ سے ناپ کر بخشتا ہے۔ اس قانون کا نام قرآن کی بولی میں سنۃ اللہ ہے۔ سنۃ اللہ اس پورے کارخانہ خلق و ایجاد میں ایسی ہمہ گیری کے ساتھ جاری و نافذ ہے کہ کبھی اس میں تخلف نہیں ہوتا۔ قرآن کے علاوہ دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے

حکومت اور خلافت فی الارض اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم الشان نعمت ہے اس لئے یہ کسی قوم کو اسی وقت بخشی جاتی ہے جب وہ اس کے لئے پوری استعداد و صلاحیت رکھتی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے سیادت و امامت کے منصب عظیم پر سرفراز فرمانا چاہا، پہلے ان کی اہلیت و استعداد کا امتحان لیا اور جب وہ تمام امتحانوں میں پورے اترے، ان کو امامت کی سرفرازی حاصل ہوئی۔

پھر یہ استعداد دو مختلف پہلوؤں سے جانچی جاتی ہے۔ ایک یہ کہ یہ مقاصد سیاست کے مطابق ہے یا نہیں دوسرے یہ کہ اس کی مقدار کتنی ہے۔ اگر یہ صلاحیت مقاصد حکومت کے لئے موزوں ثابت ہوتی ہے تو اس کی مقدار کے لحاظ سے چھوٹی یا بڑی حکومت عطا ہوتی ہے۔ اگر صلاحیت محدود ہوتی ہے، حکومت بھی محدود ہوتی ہے اور اگر صلاحیت غیر محدود ہوتی ہے، حکومت بھی عالمگیر ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے جو ادیان و ملل تھے وہ قوموں اور جماعتوں کے اندر محدود رہے کیونکہ ان کی صلاحیت عالمگیر سیادت کے لئے کافی نہ تھی لیکن امت مرحومہ کو جو خلافت بخشی گئی اس نے زمین کے تمام کناروں کو اپنے احاطہ میں لے لیا۔

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر!

اب یہیں ایک اور مسئلہ پر بھی غور کر لو کہ خلافت فی الارض کے لئے کسی جماعت میں کس قسم کی صلاحیت ہونی چاہیئے تاکہ صلاحیت کی نوعیت کا سوال طے ہو جائے۔ اس سوال کا جواب مشہور مورخ اور حکیم علامہ ابن خلدون

کے لفظوں میں یہ ہے۔

"چونکہ انسان مدنی الطبع ہے اس لئے! دشاہت اس کے لئے ایک طبعی چیز ہے۔ اور انسان بمقابلہ شر کے خیر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ اسکی اصل فطرت اور قوت ناطقہ خیر کی مقتضی ہے۔ شر اس کے قوائے حیوانی کا نتیجہ ہے بحیثیت انسان اس کو خیر اور خصائل خیر ہی محبوب ہیں۔ اور بادشاہت وسیاست اس کو انسان ہونیکی حیثیت سے حاصل ہو کیونکہ یہ انسان کے خواص میں سے ہے حیوان کے خواص میں سے نہیں ہے، اسلئے حکومت وسیاست کیلئے خصائل خیر ہی موزوں ہونگے"

اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں لکھتا ہے۔

"سیاست اور حکومت مخلوق الٰہی کی کفالت اور بندوں کے درمیان، احکام الٰہی کی تنفیذ کیلئے، اللہ کی خلافت ہے اور اللہ تعالیٰ کے قوانین جیسا کہ شرائع کے مطالعہ سے ثابت ہے، بندوں کیلئے سراپا خیر اور مصلحت ہوتے ہیں اس لئے جس قوم میں عصبیت جو قوت واستطاعت کی کفیل ہے اور خصائل خیر جو احکام الٰہی کی تنفیذ کے لئے مناسب ہیں، پائے گئے تو وہ قوم گویا کفالت خلق اور خلافت الٰہیہ کی اہلیت واستعداد سے بھرپور رہے"

حکیم اسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی اس حقیقت کی طرف جابجا اشارات کیے ہیں لیکن یہ چیز اس قدر واضح ہے کہ مزید تائید وتوثیق کی ضرورت نہیں ہے۔ سیاست اور حکومت، زمین میں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی کفالت کے لئے ہے، اس لئے اس نعمت سے وہ اسی قوم کو سرفراز فرمائیگا جو اس کے لئے موزوں اہلیت واستعداد رکھتی ہو۔ تم بوجھ ڈھونے کے لئے ایک فرد ورچاہتے ہو تو اس میں محنت وجفاکشی ڈھونڈتے ہو، اپنے مال ومتاع کی نگرانی کے لئے محافظ چاہتے ہو تو اس میں مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ۔ امانت ودیانت تلاش کرتے ہو، اپنے بچوں کے لئے اتالیق ونگراں کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی ایسے شخص کا پتہ لگاتے ہو جس میں علم واخلاق کے محاسن کے ساتھ شفقت ومحبت ہو یہی حال اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہ رب العالمین اپنی مخلوق کی کفالت کے لئے جب کسی قوم کو چننا چاہتا ہے تو اس قوم کو برگزیدہ فرماتا ہے جو جملہ محاسن خیر سے آراستہ ہو۔ وہ اپنے کلہ کا چرواہا ایسے درندہ صفت انسانوں کو نہیں بناتا جو بھیڑوں کا گوشت کھالیں اور ان کی کھالوں کے کپڑے بناکر

پہن لیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ	ہم نے زبور میں، ذکر کے بعد، لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث
أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ	ہمارے نیکوکار بندے ہوں گے۔

اب غور کرو وہ خصائل خیر ہیں جو کفالت خلق الٰہی کے لئے ضروری ہیں اور جنکی طرف علامہ ابن خلدون نے اشارہ کیا ہے، کسی قوم میں کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں؟ سیاست کے لئے جس اخلاق اور کیرکٹر کی ضرورت ہے، اس کی تفصیلات میں پڑنیکا یہ موقع نہیں ہے اور نہ چنداں اس کی ضرورت ہے۔ بس یہ اصولی حقیقت پیش نظر رکھو کہ حکومت خلق الٰہی کی کفالت ہے، اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آجائیگی کہ اس کے حصول کے لئے کسی قوم کے کیرکٹر میں کیا کیا باتیں ہونی چاہئیں۔ پھر جب تم ایک قدم اور آگے بڑھکر اس سوال پر غور کروگے کہ کسی قوم میں یہ فضائل و محاسن کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں تو اسکا صرف ایک ہی جواب ہوگا کہ نماز! کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، جملہ محاسن و فضائل کا اولین سرچشمہ نماز ہے۔ اسی سے تمام بھلائیاں وجود میں آتی ہیں اور پھر وہی تمام بھلائیوں کی حفاظت و نگہداشت کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کی تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو برگزیدہ کیا اور ان کو وہ عزت و شوکت بخشی، جو زمین پر بسنے والی قوموں میں سے، کسی قوم کو نہ بخشی جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے۔

اُذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ	اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو جبکہ اس نے تم میں انبیاء مبعوث
أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا لَمْ يُؤْتِ	فرمائے اور بادشاہ بنائے اور تم کو وہ کچھ بخشا جو دنیا کی کسی قوم
أَحَدًا مِنَ الْعَالَمِينَ (۲۱ مائدہ)	کو نہیں بخشا۔

تو ان سے ایک میثاق لیا اور اس عظمت و شوکت کو اس میثاق کے قیام و استحکام کے ساتھ مشروط کیا کہ جب تک تم اس میثاق پر قائم رہوگے، اللہ کا یہ عہد قائم رہیگا اور جس دن اس کو توڑ دوگے، خدا کی بخشی ہوئی تمام عزت و عظمت تم سے چھن جائیگی۔ یہ میثاق سورہ مائدہ کی آیتہ ۱۲ میں مذکور ہے اور اسکی پہلی دفعہ نماز ہے۔

Scanned by CamScanner

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۔

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا اور اٹھائے ہم نے ان میں بارہ نقیب اور اللہ نے کہا اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے اور میرے انبیاء پر ایمان لاؤ گے اور ان کی تائید کرو گے اور اللہ کو قرض حسن دو گے تو میں تم سے تمہارے گناہوں کو جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جنکے نیچے نہریں جاری ہوں گی، پھر اس کے بعد تم میں سے جس نے کفر کیا تو وہ سیدھے رستہ سے بھٹک گیا .....

لیکن یہود اس میثاق پر قائم نہ رہ سکے۔ وہ نماز غائب کر کے شہوات میں پڑ گئے۔ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ۔ جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کو ذلت و خواری اور دنیا کی دوسری قوموں کی محکومی اور بندگی کے لئے چھوڑ دیا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (۱۴ - مائدہ)

پس بوجہ ان کی عہد شکنی کے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔

اب اسی حقیقت کی روشنی میں خانہ کعبہ کی تاریخ پر غور کرو۔ اس کا مقصد بنا و تعمیر جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور اس کے نام سے ثابت ہے، قیام نماز ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ (بقرہ ۱۲۵)

اور یاد کرو جبکہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے مرکز اور جائے امن قرار دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے ٹھہرنے کی جگہ کو نماز کا مرکز بناؤ اور ہم نے ابراہیم و اسمٰعیل کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی کہ میرے گھر کو طواف اور اعتکاف کرنیوالوں اور رکوع و سجدہ کرنیوالوں کیلئے پاک رکھو

اس مقدس گھر کے جوار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی جو ذریت آباد کی اس کے متعلق یہ دعا فرمائی۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي
زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ
فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ
وَارْزُقْهُمْ مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (۳۷ ابراہیم)

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی زمین میں، تیرے مقدس گھر کے جوار میں بسایا ہے۔ خداوندا تاکہ وہ نماز قائم کریں پس یوں کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہوں اور ان کو پھلوں کی روزی دے کہ وہ تیرے شکر گذار رہیں۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ (۴۰ ابراہیم)

اے میرے پروردگار مجھے نماز کا قائم کرنیوالا بنا اور میری اولاد میں سے بھی، اے پروردگار میری دعا قبول فرما۔

چنانچہ بنی اسماعیل کی پوری تاریخ سے ثابت ہے کہ یہی نماز ہمیشہ ان کے عزل و نصب کی لسان المیزان رہی۔ اسلام کے ظہور کے وقت خانہ کعبہ کی تولیت اور اس کے واسطہ سے تمام عرب کی دینی پیشوائی اور سیادت قریش کو حاصل تھی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا فرمائی تھی کہ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ (اے پروردگار تاکہ نماز قائم کریں) اس دعا کو انہی کے ذریعہ پورا ہونا تھا لیکن انھوں نے خانہ کعبہ کے اس بنیادی مقصد اور اپنے وجود و قیام کی اس اصلی غایت کو فراموش کر کے، اس بیت محرم کو جو اس دنیا میں توحید اور خدا پرستی کا اکیلا گھر تھا، شرک و بت پرستی کا مرکز بنا دیا اور ان کی نماز، جو خانہ کعبہ اور خانہ کعبہ کے ساتھ ساتھ خود ان کے قیام و وجود کی اصلی غایت تھی، شرک سے آلودہ ہو کر چند بیہودہ اور بے معنی مراسم مشرکانہ کا مجموعہ رہ گئی۔

اس حالت کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنا آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اٹھایا جس نے دین حق کے تمام محو شدہ آثار و مراسم کو زندہ کرنا چاہا اور ان کو اصلاح حال کی دعوت دی لیکن انھوں نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرا بلکہ اس کی مخالفت اور دشمنی پر آمادہ ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنی شفقت و محبت کا رشتہ اس جماعت سے جوڑ لیا جو صحیح نماز کو قائم کرنیوالی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود قوت و شوکت کی فراوانی اور مذہبی پیشوائی کے غرور تقدس کے بدر کے میدان میں ان کو نہایت ذلیل شکست ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے

یارہ میں اپنے فیصلہ کا اعلان فرمایا کہ

وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ	اور ان میں کیا فضیلت تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہ
عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ إِنْ	دیتا درانحالیکہ وہ مسجد حرام سے (مسلمانوں کو) روکتے ہیں
أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا	حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں ہو سکتے اس کے متولی تو
يَعْلَمُونَ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ	وہی ہو سکتے ہیں جو پرہیزگار ہوں لیکن ان میں سے اکثر
إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً فَذُوقُوا الْعَذَابَ	نہیں جانتے اور بیت اللہ کے پاس انکی نماز محض سیٹی بجانا
بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ	اور تالی پیٹنا ہے پس اپنے کفر کی پاداش میں اللہ کا عذاب چکھو

یعنی اگر ان میں کوئی خوبی اور فضیلت کی بات تھی تو یہ تھی کہ وہ خدا کے گھر کے محافظ و نگہبان تھے اور ان کے ذریعہ بیت اللہ کا مقصد بناء و تعمیر (یعنی قیام نماز) پورا ہوتا تھا لیکن تولیت کی اصلی شرط تقویٰ ہے اور اس سے وہ بالکل خالی ہیں۔ رہ گئی نماز، سو اس کا حال یہ ہے کہ اس کی ہیئت اور حقیقت دونوں مسخ ہو چکی ہے۔ اب وہ تالی پیٹنے اور سیٹی بجانے سے عبارت ہے۔ پھر کیا چیز ہے کہ جس کے لئے اللہ ان سے اپنا رشتہ قائم رکھے اور کیوں ایسا نہ ہو کہ ان کی جڑ کاٹ دی جائے کہ ان کی جگہ پر وہ جماعت آئے جو خانہ کعبہ کے مقصد سے واقف ہے، جو بیت اللہ کی تولیت اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد نماز قائم کرے گی، زکوٰۃ دے گی، نیکی کا حکم کرے گی، برائی سے روکے گی

وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ	اور ضرور اللہ ان کی مدد فرمائے گا جو اسکی مدد کرتے ہیں
عَزِيزٌ الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ	بیشک اللہ قوت والا اور غالب ہے۔ ان لوگوں کی کہ
أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا	اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قایم کرینگے
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ	زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کرینگے، برائی سے روکینگے اور معاملات کا
الْأُمُورِ (۴۰-۴۱ حج)	انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ (باقی)

Scanned by CamScanner

مقالات

اسلام اور غیر مسلم اقوام

از

(جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز، بی۔اے)

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ ایک مکتب میں جب بچوں کو شرارت سوجھتی اور وہ مولوی صاحب کے پنجۂ استبداد سے کم از کم کچھ وقت کے لئے چھوٹنا چاہتے تو وہ منظم سازش کرتے۔ ایک آتے ہی کہتا کہ اوہو! قبلہ خیریت ہے، آج نصیب اعدا کچھ طبیعت مضمحل سی نظر آتی ہے۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھائی! رات کچھ دیر سے سویا۔ اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ رفت گزشت۔ دوسرا آتا اور سلام علیکم کے بعد مولوی صاحب کے چہرہ پر متردد انہ نگاہ ڈالکر پوچھتا کہ مولینا خیر ہے؟ آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ چہرے پر کچھ تمازت کے آثار بھی ہیں۔ مولوی صاحب فرماتے کہ ہاں بھئی! کچھ اعضا شکنی سی محسوس ہو رہی ہے۔ تیسرا ابھی آکر بیٹھنے بھی نہ پاتا کہ ایک گہری تشویش سے پوچھتا کہ مولوی صاحب مزاج گرامی میں کچھ خرابی سی نظر آرہی ہے۔ اب مولوی صاحب کا دل بھی ڈوبنا شروع ہو جاتا۔ فرماتے کہ ہاں کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی ہے۔ اور چوتھا طالبعلم ابھی آنے بھی نہ پاتا کہ مولوی صاحب لحاف اوڑھے حجرے کے گوشے میں دراز ہیں۔ اور نبض پر ہاتھ رکھو تو سچ مچ تپ چڑھ رہی ہے۔

مولوی صاحب کو بخار آجانیکا واقعہ افسانہ ہو یا حقیقت لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ پروپیگنڈا اگر منظم طریقہ سے کیا جائے تو فی الواقع اشیاء میں قلب ماہیت پیدا کر دیتا ہے۔ چیز کی نوعیت اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے زاویے بدل دیتا ہے۔ جو چاہتا ہے منوا لیتا ہے۔ اور جس طرح چاہتا ہے تسلیم کرا لیتا ہے۔ یہی وہ سحر سامری ہے جس کی نگاہ بندی سے قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ لَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا۔ لَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا۔

لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ بِھَا۔ آنکھیں اپنی ہیں لیکن دیکھتے کسی اور کی عینک سے ہیں۔ کان اپنے ہیں لیکن سنتے کسی اور کے آلۂ صوت سے ہیں۔ دل اپنے ہیں لیکن سمجھتے کسی اور کے دماغ سے ہیں۔ اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلّ بالکل "ہز ماسٹرز وائس" ہوتے ہیں۔

اسلام کے ساتھ بھی دنیا میں ایسا ہی ہوا۔ اس نے ابھی اپنی تربیت گاہ سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ یورپ کے ارباب حل و عقد کو اس سے خواہ مخواہ ایک خطرہ محسوس ہوا۔ اور انھوں نے اسکا بہترین علاج یہی سوچا کہ اسلام کو اس کے اصلی خد و خال میں کہیں ظاہر ہی نہ ہونے دیا جائے۔ ارباب سیاست کے پیش نظر کچھ اپنی مصلحتیں تھیں۔ خدایان مذہب اپنی سیادت کا تحفظ چاہتے تھے۔ چنانچہ دونوں گروہ اس مشترکہ مقصد کو لیکر اٹھے اور زبان و قلم کے زور سے اسلام کی ایک ایسی بھیانک تصویر کھینچی کہ غیر تو غیر، خود اپنے بھی جب اس کی طرف نگاہ اٹھاکر دیکھتے ہیں تو کانپ کر رہ جاتے ہیں۔ جب دولِ یورپ کا تسلط دیگر ممالک پر ہوا تو وہاں بھی اس مقصد کو انھوں نے فراموش نہیں ہونے دیا۔ اور چونکہ قاعدہ ہے کہ حاکم اقوام کی ہر ادا میں اک شان خداوندی نظر آیا کرتی ہے لہٰذا اقوام یورپ نے اسلام کی تصویر کے جو جو اڈیشن شائع کئے، دل و دماغ کے چوکھٹوں میں فریم کراکے رکھے گئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیائے تہذیب و تمدن میں جہاں کہیں اسلام کا نام آتا ہے قتل و غارت گری، بربادی و تباہی، ہلاکت و خونریزی، جور و ظلم، ستم و استبداد کے خونی مناظر ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جنہیں نظر آتا ہے کہ وحشی اور خونخوار جنگلی انسانوں کے غول کے غول نیزوں اور تلواروں کی جھنکار میں بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ان کے جلو میں بہیمیت و بربریت کے مجسمے ہولناک آہن پوش جنات کی شکل میں آگ اور خون کی ہولی کھیلتے، اللہ اکبر کے جگر شگاف نعروں میں امنڈتے چلے آتے ہیں اور اس قہر خداوندی، اس سیلاب بلا، اس طوفان بدتمیزی کے سامنے تہذیب و تمدن، علم و عمرانیت، عدل و انصاف، عفت و عصمت، مذہب و ملک ایک ایک کرکے جڑوں سے اکھڑتے، بہتے چلے جاتے ہیں۔ مظلوموں کی فریاد، یتیموں کی آہ و بکا، بیواؤں کا نالہ و فغاں آسمان تک جاتا اور ٹکرا کر واپس آجاتا ہے کہ گویا اس خونخوار قوم کے خدا کا دروازہ ان سب کے لئے بند ہے۔ اور جہاں جہاں یہ قیامت صغریٰ گذرتی ہے آبادیاں ویرانہ بنجاتی ہیں بستیاں

Scanned by CamScanner

اجڑ جاتی ہیں، کتب خانے جل کر راکھ کا ڈھیر رہ جاتے ہیں، تہذیب و تمدن کے آئینہ دار قصر شاہی کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کہیں ٹوٹی ہوئی صلیبوں کے انبار نظر آتے ہیں، کسی جگہ زنار کا ڈھیر دکھائی دیتا ہے۔ مندر ویران ہیں، گرجے مسمار ہیں، نہ برہمن کو کہیں امن ہے، نہ کلیسا کے راہب کے لئے امن۔ نہ عورتیں محفوظ ہیں نہ بچے۔ معصوموں کو قتل کر دیئے گئے۔ جو باقی رہ گئے وہ ناک میں نکیل ڈلوائے، حبشی سرداروں کے کوڑے کھاتے نخاس کی طرف گھسیٹے چلے جا رہے ہیں کہ انسانیت عظمیٰ دو دو ٹکے میں فروخت کی جائے۔

غرضیکہ یہ ہے وہ تصویر جو اسلام کے نام کے ساتھ ہی سامنے آکر آنکھ کی پتلیوں میں سکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ دیکھنے والے کا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ حقارت و تنفر، انتقام و مواخذہ کے بخارات قلب سے اٹھ کر دماغ پر چھا جاتے ہیں اور اسے اس عالم سوز تہذیب اور ننگ انسانیت تمدن کو امن و سلامتی کی دنیا سے مٹا دینے کی مختلف تدابیر و خیالات کی جولانگاہ بنا دیتے ہیں۔ آیئے۔ آج کی مختصر سی صحبت میں یہ دیکھیں کہ جس تصویر کا یہ اڈیشن آپ کے سامنے ہے، اس کے صحیح خطوط کیا ہیں اور جس تہذیب و تمدن کو تلوار اور آگ کی نسبت سے انسانیت سوز سمجھا جا رہا ہے، اس کی اصلیت کیا ہے۔ اسلام کی صورت مسخ کرنے والوں کی یہ بیباک جرأتیں فی الحقیقت داد کے قابل ہیں، کہ یہ سب کچھ وہ ایک ایسے مذہب کے متعلق پیش کرتے ہیں جس کا اصل دستور اساسی ایک ایک حرف اور نقطہ کی صحت کے ساتھ آج دنیا کے ہر کتب فروش کی دوکان سے مل سکتا ہے۔ اور جس کے صحیح علمبرداروں کا ایک ایک نقش قدم مستند تواریخ کے اوراق پر جلی اور نمایاں نظر آتا ہے۔

لفظ اسلام کا مادہ سلم ہے۔ جس کے معنی گردن جھکا دینے، حوالے کر دینے، سونپ دینے، اطاعت قبول کر لینے اور امن و سلامتی کے ہیں۔ لسانیات کے ماہر جانتے ہیں کہ الفاظ کے اشتقاق کا ان کی روح سے کس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے۔ تو جس لفظ کا مادہ ہی امن و سلامتی اور تسلیم و رضا ہو، جس کے معنی ہی جھک جانے اور حوالہ کر دینے کے ہوں اس میں جور و تعدی اور ظلم و فساد کا کیا شائبہ ہو سکتا ہے۔

اب اس کے مفہوم کو لیجئے۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ نوع انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے تخلیق آدم کے

Scanned by CamScanner

وقت سے ہی مختلف زمانوں میں، مختلف اقوام عالم کے اندر، مختلف ممالک میں خدا کے فرستادہ پیغمبر آتے رہے۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ هَادٍ ۔ ایک ہی پیغام ازلی، ایک ہی ارشاد خداوندی انسانوں تک پہنچاتے رہے۔ اس پیغام خداوندی، اس صحیفۂ سرمدی کا نام اسلام ہے۔ خواہ وہ دنیا کو نوح کی زبان سے ملا ہو یا کنفیوشس کی۔ موسیٰ و عیسیٰ کی وساطت سے آیا ہو، یا کرشن و گوتم کی۔ عبرانی میں ہو، یا یونانی میں پہلوی میں ہو یا سنسکرت میں ہر قوم اور ہر ملک میں یہ پیغام وقتاً فوقتاً آتا رہا۔ لیکن چونکہ دنیا کے پاس اس پیغام کو محفوظ رکھنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اس لئے یا تو حوادث ارضی و سماوی سے محو ہو گیا، یا انسانی دست درازیوں نے اس میں تحریف و الحاق کر دیا، یا وہ فراموش کر دیا گیا، یا چھپا دیا گیا۔ بہرحال جب بھی اس میں کوئی نقص یا خرابی واقع ہو جاتی، اس پیغام کو اسکے اصلی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ یہی ہوتا رہا۔ غرضیکہ عالم انسانیت نے جب کچھ ارتقائی منازل طے کر کے ذہن کی پختگی حاصل کر لی کہ جس سے وہ ایک مستقل سطح پر کھڑا ہو سکے تو اسی پیغام ایزدی کو نبی امیؐ کی وساطت سے دنیا تک پہنچایا گیا۔ اور اس بات کا خود اللہ تعالیٰ نے ذمہ لے لیا کہ اس پیغام کو اب جملہ تحریفات انسانی اور حوادث زمانی و مکانی سے محفوظ رکھا جائے گا۔ نام اس کا بھی اسلام ہی رکھا کہ اُسی پیغام اولین کا آخری و مکمل ایڈیشن ہے۔ چنانچہ جہاں یہ بات مسلّم ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اپنے ہاں ایسی کتاب نہیں رکھتی جسے وہ حتمی طور پر کہہ سکے کہ ان کے بانی مذہب کا اصل اور غیر محرف صحیفہ ہے، وہاں تاریخ اس بات کی بھی شہادت دے رہی ہے کہ قرآن پاک اپنے ایک ایک حرف اور نقطہ کے ساتھ اسی طرح موجود ہے جس طرح نبی اکرمؐ پر نازل ہوا تھا۔

لہذا حکم یہ دیا گیا کہ یہ مانتے ہوئے کہ مختلف اقوام عالم کے ہاں جو پیغمبر آتے رہے سب منجانب اللہ سچے اور برحق تھے اس بات پر ایمان لانیکی دعوت تمام اہل عالم کو دی کہ اب ان محرف شدہ اور غیر یقینی نسخوں کی جگہ اس نسخہ کو دستور العمل بنائیے کہ جس میں تمام صداقتیں اپنے اصل فارم میں محفوظ ہیں۔ چنانچہ جو شخص محمدؐ رسول اللہ کی نبوت پر ایمان لاتا ہے اس سے اس کے ساتھ ہی تمام انبیائے سابقہ اور کتب آسمانی کے منجانب اللہ ہونے کا بھی اقرار لیا جاتا ہے۔ اور کوئی مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ وہ محمدؐ رسول اللہ کے ساتھ ہی ساتھ تمام اقوام عالم کے انبیاء کرام پر (جنھیں وہ خواہ کسی نام سے پکارتے ہوں) بھی ایمان نہ لائے۔ اور کسی ایک میں بھی فرق نہ کرے۔ دیکھئے قرآن کریم اسے کس انداز میں بیان فرماتا ہے۔

Scanned by CamScanner

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۔ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۔

(۳ : ۸۲ - ۸۳)

کیا پھر یہ لوگ دین خداوندی کے سوا کسی اور دین کو چاہتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے۔ خوشی یا بے اختیاری سے سب اس کے سامنے سرافگندہ ہیں۔ اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائینگے۔ آپ کہدیجئے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا ہے۔ اور اس پر جو ابراہیم و اسمعیل و اسحٰق و یعقوب اور اولاد یعقوب کی طرف بھیجا گیا ہے اور جو موسیٰ و عیسیٰ اور دیگر (تمام) انبیاء کو دیا گیا ہے۔ ان کے رب کیطرف سے۔ ہم ان میں کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ اور ہم اللہ ہی کے مطیع و مسلم ہیں۔

اس میں بعض انبیاء کا نام لیا گیا ہے کہ جن سے مخاطبین عرب واقف تھے۔ اور باقیوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ ۔ دوسری جگہ ہے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ (۴ - ۱۶۴)

ایسے پیغمبر جنکا حال ہم اس سے قبل آپ پر بیان کر چکے ہیں اور ایسے پیغمبر کہ جنکا حال ہم نے آپ پر بیان نہیں کیا۔

لہذا ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دنیا کی ہر قوم کے پیغمبر پر ایمان لانا ضروری ہے اور کسی ایک میں بھی تفریق کرنا جائز نہیں۔ اب خیال فرمایئے کہ جس مذہب کا پہلا سبق یہ ہو۔ جو اس تعلیم کو ایمانیات میں داخل کر رہا ہو۔ جو ذہن انسانی میں اس اصول کی پختگی سے مرتسم کر رہا ہو کہ تمام نوع انسانی کے بزرگ ایک ہی روشنی کے حامل اور ایک ہی خدا کے فرستادہ تھے اور وہ سب یکساں طور پر قابل تعظیم ہیں۔ وہ مذہب دنیا کے لئے امن و سلامتی کا مذہب ہوگا یا فتنہ و فساد کا۔

یہ تو رہا ان انسانوں سے سلوک جو کسی نہ کسی آسمانی طریقہ پر چلنے کے مدعی ہیں۔ لیکن جو لوگ خدا کو بھی ایک نہیں مانتے۔ بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں، اسلام ان کے متعلق بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ

Scanned by CamScanner

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۶: ۱۰۹)

اور جن کو یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہیں، ان کو گالی مت دو کہ وہ لوگ براہ جہل، حد سے گذر کر اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے۔ اسی طرح ہر طریقہ والوں کو ان کا عمل مرغوب بنا رکھا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے رب ہی کے پاس جانا ہے۔ جو ان کے اعمال ان پر ظاہر کر دے گا

اس آیت میں صرف بتوں کی پرستش کا ہی ذکر نہیں، بلکہ خدا کو چھوڑ کر جس چیز کی بھی کوئی پرستش کرتا ہے، اس کے حق میں گستاخی کا کلمہ کہہ دینے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ اسے حکم ہے کہ اگر اپنا پیغام دوسروں تک پہنچائے تو نہایت نرمی اور سنجیدگی سے حتی کہ وہ کجروی کی بحث اور جھگڑوں سے بھی اجتناب کرتا ہے۔

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ (۱۶: ۱۲۵)

اپنے رب کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے بلائیے۔ اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بحث کیجیے۔ آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو بھی جو اسکے راستہ سے بھٹک گیا اور اس کو بھی جو اس کے راستہ پر چل رہا ہے۔

جہاں معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ مخاطب کسی معقول بات پر کان ہی نہیں دھرتا، وہاں اس پر اظہار غیظ و غضب کے بجائے یہ حکم دیا گیا کہ اس سے اسوقت اعراض کرو۔ لیکن اس کو اسکی گمراہیوں میں چھوڑ کر اس کی تباہی کا تماشا نہ دیکھو۔ وہ قوانین فطرت کی مخالفت کر رہا ہے اور سمجھتا نہیں کہ اس سے اسکا اپنا ہی نقصان ہے۔ وہ راستہ کی خطرناک کھائیوں اور عمیق غاروں سے واقف نہیں لیکن اپنی سرکشی اور طغیان میں کسی دوسرے کی آواز کو سننا نہیں چاہتا۔ وہ زہر کو تریاق سمجھکر پی جانا چاہتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اس کے ایک ایک قطرے میں کسقدر ہلاکتیں پوشیدہ ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی طبیب و ناصح سے جھگڑتا بھی ہے تو چونکہ اسوقت اسکا دماغی توازن درست نہیں، عقل ماؤف ہو رہی ہے اس لئے حکم دیا گیا کہ سردست اس سے کنارہ کشی کرو۔ لیکن ایک مشفق طبیب، ایک غمخوار ناصح، ایک

سچے ہمدرد، ایک خیر اندیش راہبر کی طرح اسے اور اور طریقوں سے سمجھانے کی کوشش کرو، کہ کہیں اس کی حماقت اسے تباہی کی طرف نہ لے جائے۔ فرمایا۔

وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ (۶ : ۷۰)

اور جن لوگوں نے اپنے دین کو لہو و لعب بنا رکھا ہے ان سے کنارہ کش رہ۔ کہ دنیوی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ اور قرآن کے ذریعہ سے نصیحت بھی کرتا رہ۔ تاکہ کوئی شخص اپنے اعمال و کردار کے سبب اسطرح نہ پھنس جائے

اسلام کا مقصد یہ نہیں کہ اگر لوگ اسے قبول کرلیں تو اس کی تجارت میں فائدہ ہوگا۔ یا اس کے خدا کا کوئی نفع اس میں مضمر ہے۔ خدا کی ذات اس سے بہت بلند ہے۔ اگر ساری دنیا اس کی عبادت کرنے لگ جائے، تو اس کی شان کبریائی میں ذرہ بھر بھی اضافہ نہیں ہوسکتا اور اگر تمام دنیا اس سے منحرف ہوجائے تو اس کی قدرت و اختیار میں کچھ کمی نہیں واقع ہوسکتی۔ اس کی ارسال فرمودہ ہدایت کو جو مانیگا اس کے اپنے لئے ہے۔ اور جو اس سے روگردانی کریگا۔ اس کا وبال بھی اسی کے لئے ہے۔

فَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهِ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ (۲۷ : ۴۰)

جو قبول کرتا ہے وہ اپنے لئے قبول کرتا ہے۔ اور جو انکار کرتا ہے (وہ بھی اپنے لئے) یقیناً میرا رب تو بے نیاز و کریم ہے

جب معاملہ یوں ٹھہرا تو پھر جبر و اکراہ کیسا۔ اور زبردستی کس مقصد کے لئے۔ اب آپ خود اندازہ فرمایئے کہ اس اسلام اور اس کے انداز تبلیغ میں کونسی بات قابل اعتراض ہے۔

اب اس جنگ و قتال کے الزام کو دیکھیے جس کی بنا پر اسلام کو ایک وحشیانہ مذہب قرار دیا جاتا ہے لیکن اس اعتراض کے جواب سے پہلے ایک مقدمہ ذہن نشین کرلینا ضروری ہے۔ دنیا میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مذہب اور امور دنیا دو الگ الگ شعبے ہیں۔ ایک کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔ جتنا کوئی شخص زہد و تقویٰ

تورع و تقشف میں بڑھتا جائیگا، اتنا ہی دنیا سے دور ہوتا جائیگا۔ اور جتنا دنیاوی معاملات میں حصہ لیگا، اتنا ہی مذہب سے بعد ہوتا جائیگا۔ کلیسا کے راہب اور Nuns کے لئے تارک الدنیا ہونا ضروری ہے۔ سنیاسی آشرم، گرہست آشرم سے بالکل الگ شعبہ حیات ہے۔ خدا کی بادشاہت میں کوئی ایسا شخص داخل نہیں ہوسکتا جس کے پاس دنیاوی مال و متاع ہو۔ کوئی بھکشو کسی دنیاوی معاملہ میں حصہ لینے کا مجاز نہیں۔ غرضیکہ دنیا داروں کے دھندے جدا گانہ ہیں اور مذہب والوں کا میدان الگ۔ لیکن اسلام اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کے نزدیک دین کی ضرورت ہی اسلئے ہے کہ وہ امور دنیا کو خدائی قانون کے مطابق منضبط و مشکل کرکے وحدت انسانی پیدا کردے۔ اس کے نزدیک دین و دنیا دو الگ الگ شعبے نہیں بلکہ نظام عالم کا تانا بانا ہیں۔ دین اس کی دنیا ہے اور دنیا اسکا دین۔ ہر وہ دنیاوی معاملہ جس کی بنا تقویٰ پر ہو دین ہے۔ اور دین کا وہ حصہ جس سے مادی نتائج مترتب ہوں، دنیا ہے۔ ایک زاہد شب زندہ دار اپنے زہد و تقویٰ میں بھی اسی دستور العمل حیات سے روشنی حاصل کرتا ہے جس سے ایک سوداگر منڈی میں، ایک صاحب خانہ گھر کی چار دیواری کے اندر، ایک سپاہی میدان جنگ میں اور ایک رئیس قوم اپنی مملکت میں۔ ایک مسلمان کی خدا سے صحیح دعا یہی ہے کہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً لہذا جو معاملات امور دنیاوی میں ایک مسلمان کو دیگر بنی نوع انسان سے پیش آئیں گے، اس کا قرآن ان معاملات میں بھی اس کی رہبری کریگا۔ یہ بنیادی فرق ہے جسے نظر انداز کر دینے سے اسلام کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ قرآن کریم حیات انسانی کے تمام شعبوں میں، فطرت انسانی کے تمام گوشوں میں، دین و دنیا کے تمام کاروبار میں، ایک مسلم کے لئے نصب العین زندگی ہے تو اس کے فطرتِ انسانی کے مطابق ہونیکی سب سے پہلی یہی شرط ہوگی کہ وہ تمام معاملات میں فطرت انسانی کے تمام مقتضیات کو پیش نظر رکھے۔ اور ایسی سوسائٹی کی تشکیل و تدوین کرے جو نوع انسانی میں امن و امان قائم رکھ سکے، کہ راہب اور سنیاسی پیدا کر دینا، جو دنیا تیاگ کر جنگلوں میں جا بسیں، تو آسان ہے۔ انسان پیدا کرنا، جو درختوں اور جانوروں سے نہیں بلکہ اپنے ہم جنس دوسرے انسانوں سے انسانی سلوک روا رکھیں، ذرا مشکل ہے۔ مذاہب عالم میں چونکہ دین کو دنیا سے بالکل الگ قرار دیا گیا ہے

اس لئے ان کے ہاں مذہبی تعلیم کا دائرہ صرف اسی حد تک ہے کہ دنیا میں انسان کو محبت اور پریم، صلح اور آشتی، عفو و درگذر، اکھنشا اور شانتی سے رہنا چاہئے۔ انسان تو ایک طرف کسی حیوان کو بھی ستانا نہ چاہئے، دشمنوں کے ساتھ بھی محبت اور پیار سے پیش آنا چاہئے، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا آگے کر دینا چاہئے، جو تمہارا کوٹ اتارے اسے واسکٹ خود بخود اتار کر دیدینی چاہئے۔ یہ تعلیم بظاہر بڑی خوش آیند اور Appealing معلوم ہوتی ہے لیکن غور سے دیکھئے تو یہ تعلیم صرف انہی لوگوں کے لئے قابل عمل ہو سکتی ہے جو انسانوں کی بستیوں سے دور قطع علائق کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ ورنہ جو شخص ایسی دنیا میں رہنا چاہے جہاں فرشتے نہیں بلکہ آدمی بستے ہوں، اس کے لئے ہر مقام پر یہی تعلیم قابل عمل نہ ہو سکے گی۔ فی الحقیقت محبت، پیار، پریم، شانتی، عفو، درگذر، تسامح، چشم پوشی مستحسن جذبات ہیں۔ لیکن وہیں تک جہاں ان کا موزوں مقام ہو۔ ورنہ دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے آپ کو محبت اور پیار کے علاوہ نفرت و خشونت کی بھی ضرورت ہے۔ عفو و درگذر کے ساتھ ساتھ سزا اور انتقام کی بھی حاجت ہے۔ ایک مظلوم کے ساتھ اگر آپ کو ہمدردی ہے تو یقیناً ظالم سے نفرت برتنی پڑے گی اور زبردست سے کسی زیر دست کا حق دلانے کے لئے آپ کو عفو و درگذر نہیں بلکہ مواخذہ و انتقام سے کام لینا ہوگا۔ نظام عالم چلانے کیلئے صحیح عدالتوں کا قیام اور فرائض شناس محکمہ احتساب کا تعین بھی ایسا ہی ضروری ہے جیسا اخلاق کے مصلحین کا وجود۔ اور اسلام چونکہ دین اور دنیا دونوں کا مذہب ہے، اس لئے وہ کبھی فطرت انسانی کی ان ضروریات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کی تعلیم محض نظری ہی نہیں کہ کبھی عمل میں نہ لائی جا سکے بلکہ ایسی عملی ہے کہ اگر دنیا صحیح معنوں میں اس پر کاربند ہو جائے تو کسی نظریئے اور تھیوری، ازم اور رائیت کے وضع کرنے کی ضرورت ہی لاحق نہ ہو لہذا اگر یہ درست ہے کہ دنیا سے قتل و خونریزی کی وارداتیں کم کرنے کے لئے قاتلوں اور فتنہ پردازوں کو حوالہ دار و رسن کر دینا خلاف تہذیب نہیں۔ ایک بچھڑے کی تکلیف مٹانے کے لئے اسے انجکشن سے ہلاک کر دینا، ایک اہنسا کے اوتار کے نزدیک بھی ظلم نہیں۔ کونین کی ایک ٹکیہ سے ملیریا کے کروڑہا جراثیم (Bacteria) کو فنا کر دینا ان کے نزدیک بھی پاپ نہیں جو منہ پر کپڑا باندھ کر سانس لیتے ہیں کہ کوئی کیڑا اندر جا کر تلف نہ ہو جائے۔ اگرچہ

Scanned by CamScanner

کو قید کر دینا، غدار کو جلاوطن کرنا، مفسد کو سولی پر چڑھا دینا کسی قانون میں ناجائز نہیں۔ اور اگر اس ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دینا جو لاعلاج ہو چکا ہو اور جسکا زہر باقی جسم کے لئے موت کا پیام لئے ہوئے ہو کسی اصول کے ماتحت جرم نہیں، تو یقین مانئے کہ دنیا سے جنگ کا خاتمہ کرنے، اور امن و امان قائم رکھنے کے لئے سرکش و متمرد انسانوں کے خلاف جنگ کرنا بھی قابل اعتراض نہیں۔ اور یہی ہے وہ علت غائی جس کے لئے اسلام نے لڑائی کی اجازت دی ہے۔ فرمایا کہ اگر کوئی فتنہ پرداز، مفسد، سرکش فرعنہ، دھرمظلوم انسانوں پر گوشۂ عافیت تنگ کر دیں، اور کمزور کے حقوق محض اس لئے پائمال ہوتے چلے جا رہے ہوں کہ اسکے بازو میں ان کی مدافعت کی قوت موجود نہیں، تو۔

فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا	ان سے لڑائی کرو۔ یہانتک کہ جب ان کی کمر ہمت ٹوٹ جائے
الْوَثَاقَ۔ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتّٰى تَضَعَ	تو ان کو مضبوط باندھ لو پھر یا تو بلا معاوضہ چھوڑ دو یا کچھ
الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۴۷:۴	فدیہ لیکر۔ یہانتک کہ خود لڑائی اپنے سے ہتھیار رکھدے۔

اس لئے کہ اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ خرمنِ انسانی میں فتنہ کی چنگاری کا موجود رہنا، اسکا سر کچل دینے سے کہیں زیادہ مہیب و خوفناک ہے لیکن اگر اس کے باوجود بھی سمجھا جائے کہ جنگ کرنا بہرحال قابل اعتراض ہے تو پھر ہمارا الزامی جواب یہ ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب، بہ ہمہ دعاوی صلح و آشتی اس اعتراض سے نہیں بچ سکتا۔ تفصیل کا موقع نہیں، صرف چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سامی مذاہب میں عہد عتیق سب سے پرانا صحیفہ ہے۔ اس میں قتل و خوں ریزی کی اتنی داستانیں ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ مثلاً سموئیل دوم ۵/۱۹-۲۰ میں ہے "تب داؤد نے خداوند سے مشورت پوچھی کہ میں فلسطین پر چڑھ جاؤں تو کیا تو ان کو میرے قابو میں کر دیگا۔ خداوند نے فرمایا کہ چڑھ جا میں بیشک فلسطینیوں کو تیرے ہاتھ میں کر دونگا۔ سو داؤد وہاں آیا اور ان سب کو وہاں مارا۔" گنتی ۳۳/۵۰-۵۲ میں ہے کہ خداوند نے موسیٰ سے خطاب کر کے فرمایا کہ بنی اسرائیل سے کہہ کہ جب تم یردن سے پار ہو کر کنعان کی زمین میں داخل ہو تو وہاں کے تمام باشندوں کو اپنے سامنے سے بھگا دو، ان کی مورتیاں فنا کر دو، ان کے بتوں کو نابود کر دو اور ان کے اونچے اونچے مکانوں کو ڈھا دو اور وہاں کے باشندوں کو وہاں سے خارج کر دو اور خود وہاں آ بسو

کیونکہ وہ زمین تمھیں دی ہے کہ اس کے مالک بنو"

عیسائیت اپنے آپ کو دنیا بھر میں صلح و محبت کا مذہب کہتی ہے۔ لیکن دیکھئے وہاں کیا ملتا ہے۔ متی ۱۰/۳۴ میں ہے "یہ نہ سمجھو میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلانے آیا ہوں۔ کیونکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اسکی ساس سے جدا کروں"۔ اگرچہ جناب مسیحؑ کے بہت سے اقوال ایسے بھی ہیں جن سے جنگ کے خلاف تعلیم ملتی ہے لیکن اہل نصاریٰ کی اکثریت اسی طرف ہے کہ جنگ کا جواز جناب مسیحؑ کی تعلیم سے ملتا ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کے مدیر نے اس باب میں ایک بسیط مقالہ لکھکر یہ ثابت کیا ہے کہ عیسائیت میں جنگ کی اجازت ہے۔ ورنہ صلیبی لڑائیوں کا تمام تقدس گناہ میں بدل جائے گا۔

جناب کنفیوشس کا قول ہے کہ سلطنت کے لئے قربانی اور جنگ نہایت ضروری ہے۔

شاہ توران نے زرتشت کا مذہب قبول کرنے سے انکار کیا تو اس کے قتل کا فتویٰ دے دیا گیا۔

ہندو مت میں رامائن اور مہابھارت کی سی مذہبی کتابیں ویدھ کے فلسفہ پر ہی مبنی ہیں۔ علاوہ بریں رگوید میں ہے کہ "اے بیحد طاقت رکھنے والے پرمیشور اس بڑی بھاری جنگ میں جسمیں ہم سیکڑوں تروتوں کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ آپ اعلیٰ سکھ دینے والی کرامتوں سے ہماری مدد کیجئے"۔ منوسمرتی میں ہے کہ "لڑائی میں لڑتے ہوئے اور لڑائی سے منہ نہ پھیر کر جو کھشتری مرتا ہے، وہ سورگ میں جاتا ہے"۔ سوامی دیانند نے لکھا ہے کہ "جنگ کے بغیر اعلیٰ عزت اور دولت کثیر حاصل نہیں ہو سکتی (بھومکا اردو)

لیکن دیکھئے اسلام قوانین جنگ میں کیا اصول پیش کرتا ہے۔ اور ہر حکم میں فطرت انسانی کی تمام کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ دنیا میں امن و سلامتی کے استقرار و استحکام کی کیسی عملی اسکیم تیار کرتا ہے۔

عجز و انکسار، صلح و بردباری کو قرآن کریم نے مکارم اخلاق میں سے قرار دیا ہے۔ اور وہ اللہ کے نیک بندوں کی یہی خصوصیتیں بیان فرماتا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲۵ : ۶۳)

اور اللہ کے بندے زمین میں عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب ان سے جاہل لوگ جہالت کی بات کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کہتے ہیں۔

اس کا بھی جناب مسیحؑ کی طرح یہی ارشاد ہے کہ جہانتک ہو سکے برائی کو نیکی سے روکنے کی کوشش کرو۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ (۲۳ : ۹۶)

بدی کا دفعیہ اچھے برتاؤ سے کرو۔

لیکن جب وقت ایسا آجائے کہ اس قسم کے عفو و درگذر، حلم و بردباری سے شریر الطبع انسانوں کے حوصلے بڑھتے جائیں، وہ نیکی سے روکے جانے سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگ جائیں، تو اسوقت اتنی اجازت دی کہ تم بھی ان سے بدلہ لے سکتے ہو لیکن صرف اتنا جتنا تم پر اس نے ظلم کیا ہے۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (۲ : ۱۹۴)

پھر جو تم پر زیادتی کرے، تو تم بھی اس کا بدلہ لو۔ (لیکن) اتنا ہی جتنی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔

لیکن انتقام کی اس اجازت میں بھی تاکید کر دی کہ اگر دشمن میں ندامت و پشیمانی کے آثار نظر آئیں تو اسے معاف ہی کر دو تو اچھا ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (الشوریٰ)

برائی کا بدلہ برائی ہے ویسی ہی، لیکن جو شخص معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا بدلہ اس کے اللہ کے ذمہ ہے۔

یہی انفرادی جور و ستم، ظلم و تعدی جب اجتماعی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے درپئے تخریب ہو جاتی ہے تو اس وقت بدلہ اور انتقام کی شکل بھی قومی اور اجتماعی ہو جاتی ہے، اسی کا نام جنگ ہے۔ جائز ہو تو قابل الزام اور مدافعانہ ہو تو عین اقتضائے فطرت کے مطابق۔ قرآن کریم کے نزدیک دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی اور قابل قدر انسانی زندگی ہے۔ اور کسی جان کو ناحق ضائع کرنا اس کے نزدیک جرم عظیم ہے۔

كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا

ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھدیا کہ جس شخص نے کسی دوسرے

بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (۵-۳۲)

شخص کو قتل کر دیا۔ علاوہ ان صورتوں میں کہ ملزم نے کسی کی جان لی ہو یا دنیا میں فساد کا موجب ہوا تو یوں سمجھو کہ گویا اس شخص نے تمام نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جس شخص نے کسی ایک جان کو بھی بچایا

اب فرمائیے جس مذہب کی تعلیم یہ ہو وہ قتل و خوں ریزی کو کسقدر نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن وہ چونکہ ایک مکمل دستور العمل ہے ہمیشہ کے لئے نافذ رہنے کے لئے دیا گیا ہے، اس لئے اس میں فطرت انسانی کے اس شعبے کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جہاں پہونچکر کبھی کبھی جنگ کا امکان بھی ہو جاتا ہے۔ اس جگہ مجھے پھر وہی الفاظ دھرانے پڑتے ہیں کہ جب کوئی سرکش و متمرد قوم کمزوروں کے لئے دنیا تنگ کر دے، نصائح و عبر کارگر نہ ہوتی ہوں، ان کے قلوب شقاوت و قساوت سے بالکل اندھے ہو چکے ہوں، وہ اپنے سوا کسی انسان کو انسان ہی نہ سمجھیں تو ایسے وقت میں اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ ان متمرد فراعنہ کے قاہرانہ جبر و استبداد کی مدافعت کی جائے۔ کمزوروں کی حمایت کیلئے قوی انسانوں کے دست و بازو محافظ بنجائیں، ان کے سینے سپر ہو جائیں، ان کی صفیں قلعے بنجائیں اور غرور و تکبر، ظلم و ستم کے سیلاب روکنے کے لئے ان کا ہر اثاثہ ایک مضبوط بند کی شکل میں تبدیل ہو جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچکر اسلام نے جنگ کی اجازت دی ہے۔ اور یہی وہ ضرورت ہے جس کے لئے اسے قتل انسانی جیسے دل ہلا دینے والے فعل کو روا رکھنا پڑا ہے۔ کہ اگر ایک شریر النفس انسان کے ضائع ہو جانے سے سیکڑوں سعید روحیں بچ سکتی ہیں تو یہ امر مجبوری ایسا کرنا ہی قرین مصلحت ہوگا۔ چنانچہ اسلام کی تاریخ میں جب ایسا وقت آیا کہ دشمنوں کے مظالم سے تنگ آکر مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا، بیوی بچے چھوڑ دیئے، تین سو میل کے فاصلے پر ایک اجنبی بستی میں جاکر پناہ لی۔ لیکن سرکش انسانوں کی دراز دستیوں نے وہاں بھی ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ ایک ہزار جری سپاہیوں کی فوج سیلاب کی طرح امنڈتی ہوئی چلی آئی کہ ان تین سو تیرہ مظلوم و بیکس انسانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے جنکا جرم صرف یہ تھا کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہ۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ تو اس وقت تمام حجتیں پوری ہو چکی تھیں، موت و زیست کا سوال تھا۔ اس وقت بہ ہزار مجبوری، ان کو اس کی اجازت دی گئی کہ ہاں تم بھی اب ان کے مقابلہ میں لڑ سکتے ہو۔ لیکن یاد رہے

کہ تمہارا ہاتھ صرف مدافعانہ اٹھیگا۔ جارحانہ نہیں اٹھیگا۔ جس قدم پر وہ رکیں گے، تمہیں بھی رک جانا ہوگا۔ جس مقام پر انکی تلواریں جھک جائیں گی، ساتھ ہی ساتھ تمہارے ہاتھ بھی جھک جائیں گے۔ اگر اس کے بعد کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو یاد رکھو۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔ یہ سب اس لئے کہ دنیا میں کوئی جماعت تو ایسی ہونی چاہیئے جو حق و صداقت کی علمبردار ہو، مظلوموں کی داد رسی کرے، کمزوروں کی مدد کے لئے اٹھے۔ یہی وہ مصالح ہیں، جسے قرآن نے حق کے لفظ سے تعبیر کیا ہے Truth۔ اور حق کا غالب رہنا خود اہل زمین کے لئے از بس ضروری ہے۔ کہ

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَھْوَاءَھُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھِنَّ (۲۳-۷۱)

اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں (آباد) ہے سب کچھ تباہ ہو جائے۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو بہ جبر مسلمان کرنے کے لئے جنگ کی اجازت دی گئی ہے، تو قرآن کریم کے موجود ہوتے ہوئے اس سے بڑھکر اور کوئی غلط الزام اس کے سر نہیں تھوپا جاسکتا۔ قرآن کا فرمان ہے۔

لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ (۲:۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت اور گمراہی بالکل واضح ہو چکی ہے۔

کیا دنیا کا کوئی مذہب اپنے ہاں ایسی کھلی کھلی تعلیم دکھا سکتا ہے جس میں مذہب کے معاملہ میں جور و تعدی سے اس وضاحت کے ساتھ روکا گیا ہو۔ دین، قرآن کے نزدیک قلب کے اطمینان کا نام ہے۔ اور اطمینان قلب اور جبر و اکراہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ لہذا دین میں جبر کیسا۔ برعکس اس کے اسلام تو مذہب کو کسی مذہب میں بھی جبر و اکراہ پسند نہیں کرتا۔ جنگ کی ضرورتوں میں اس نے اس حقیقت کبریٰ کو بھی بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کمزور جماعتوں کی حفاظت قوی جماعتوں کے ہاتھوں نہ کراتا تو دنیا میں کمزور جماعتوں کے مذہبی شعائر منہدم کر دیئے جاتے۔ اور جس جماعت کو غلبہ حاصل ہوتا وہ دوسروں کے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتی چنانچہ تاریخ عالم گواہ ہے کہ دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ فرمایا ہے۔

---

۵ ملاحظہ ہو ۲:۱۹۰-۹۲؛ ۴:۹۱؛ ۹:۱۳؛ ۹:۳۶ وغیرہ منہ

Scanned by CamScanner

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (۲۲-۴۰)

اگر اللہ انسانوں کی بعض جماعتوں کو بعض جماعتوں کے ذریعہ سے روکتا نہ رہتا تو گرجے، اور صومعے اور مندر اور مساجد جن میں اللہ کا ذکر بہت ہوتا ہے، سب گرا دیے جاتے

اس اصول کو بیان کر کے فرمایا کہ اگر مسلمانوں کو دنیا میں قوت و غلبہ حاصل ہو گا تو ان کا نصب العین حیات جور و تعدی نہیں ہو گا، بلکہ وہ دنیا میں رہیں گے تو اس لئے کہ دنیا میں وحدت خالق کی بنا کو قائم رکھیں، دولت مندوں کے مال سے غریب اور کمزور انسانوں کی مدد کریں۔ جہاں جہاں برائی ہو اسے وہاں سے روکیں۔ اور اس کی جگہ بھلائی کا حکم دیں۔ گویا مسلمان تو اللہ کا ایک ایسا سپاہی ہے کہ جہاں کہیں کسی غریب مظلوم پر کوئی زیادتی ہو رہی ہو، اسکی تلوار اس کی حفاظت کے لئے بے نیام ہو جائے

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲:۴۱)

یہ تو وہ لوگ ہیں کہ اگر زمین میں متمکن ہو جائیں تو یہ خدا کی عبادت کو قائم رکھیں گے، زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔ اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہو گا۔

مذہب کے معاملہ میں اس کا حکم ہے کہ جہاد ضرور کرو، لیکن تیر و تفنگ، نیزہ و تلوار سے نہیں، بلکہ قرآن سے جہاد کرو۔ اور اس جہاد کو اس نے جہاد اکبر قرار دیا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (۲۵:۵۲)

پس کفار کی اتباع مت کرو۔ اور ان سے اس (قرآن) کے ساتھ ایک بڑا جہاد کیے جاؤ۔

اس کا ارشاد ہے کہ اگر عین جنگ کے دنوں میں بھی کوئی مشرک تمہارے ہاں آکر پناہ لے تو اسے پناہ دیدو۔ پھر اسے قرآن سناؤ۔ اور اس کے بعد وہ اپنے گھر جانا چاہے تو اسے بحفاظت اس کے گھر پہنچا دو۔ فرمایا

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ (۹:۶)

اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے تم سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دیدو یہانتک کہ وہ قرآن سن لے۔ پھر اسکو اسکی امن کی جگہ

تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ معترض ہم سے نہ سنے۔ خود ان کتابوں کو اٹھا کر دیکھے جنکا معتبر ہونا خود غیر مسلم مصنفین تک کو تسلیم ہے۔ معلوم ہو جائیگا کہ کسقدر مذہبی آزادی اسلام نے دے رکھی تھی۔ عیسائی دنیا نے حضرت عمرؓ کو مذہب کے معاملہ میں سب سے زیادہ متشدد قرار دیا ہوا ہے۔ اور آپ کے متعلق کچھ اس قسم کا تصور دنیا تک پہنچا رکھا ہے کہ گویا تلوار آپکے ہاتھ میں برہنہ ہوتی اور آپ بے محابہ ادھر ادھر دوڑے پھرتے جو سامنے آتا یا اسے کلمہ پڑھا دیتے یا سر قلم کر دیتے لیکن مذہبی تعصب کی عینک اس واقعہ کو کہاں چھپا دیگی کہ خود حضرت عمرؓ ہی کا ایک غلام عیسائی تھا۔ آپ اکثر اسے اسلام کی تلقین فرماتے رہتے لیکن وہ اپنے آبائی مذہب کو چھوڑنے پر رضامند نہ ہوتا۔ اور آپ حیران ہوں گے کہ وہ ساری عمر عیسائی ہی رہا اور رہا بھی حضرت عمرؓ کے پاس ہی نہ معلوم وہ غلام ہی کچھ ایسا سخت جان واقع ہوا تھا یا حضرت عمرؓ کی تلوار ہی کند ہو چکی تھی۔

(باقی)

قرآن میں حذف

کلام عرب کا یہ خاص اسلوب ہے کہ فہم مخاطب پر اعتماد کرتے ہوئے اتنی ہی بات ذکر کی جاتی ہے جو اثبات مدعا کے لئے کافی ہو۔ اس لئے عموماً شرط کی جزا اور جواب قسم وغیرہ حذف کر دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں شعراء جاہلیت کے اشعار میں بکثرت ملتی ہیں۔ قرآن میں بھی یہ اسلوب ملحوظ ہے۔ لیکن نحویین اسکا لحاظ نہیں کرتے اس لئے وہ دھوکا کھاتے ہیں۔ چنانچہ کسائی اور فراء نے اپنے قواعد نحو کا اعتبار کرتے ہوئے "اَلْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ" کا جواب، آیت "اِنَّهٗ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ" کو قرار دیا ہے حالانکہ یہاں جواب قسم محذوف ہے۔ حذف کی مثالیں، قرآن میں بے شمار ہیں۔

(اقتباس) کتاب الرسالۃ للفراہی

فراہیؒ

آرزو

استاذ امام کے چند متفرق اردو اشعار

خاک ہے گر جہان میں کچھ ہے
وہم ہے گر گمان میں کچھ ہے

تجھ پہ کیا اعتبار اے ہستی
آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے

دیر سے چپ ہے کیوں فراہی زار
دیکھو اس نیم جان میں کچھ ہے

چاہو تم اتنا ہی جتنا چاہئے
اور نہ چاہو کچھ تو پھر کیا چاہئے

اس جہانِ پست میں کیا چاہئے
چاہنے کو اس سے بالا چاہئے

وہ نہیں ملتا تو چاہیں اور کیا
اور جو ملتا ہے تو پھر کیا چاہئے

کب اسے دیکھیں، یہی دیکھا کئے
آگے کیا دکھلائیں، دیکھا چاہئے

ہے بقدرِ ساز و سامانِ بارِ دل
راہ رو کا بوجھ ہلکا چاہئے

صحبتوں سے دل مکدر ہو گیا
یاں ہمیں ایک گوشۂ تنہا چاہئے

"آج" سے "کل" دور کچھ اتنا نہیں
بس ابھی سے فکرِ فردا چاہئے

کون ہے جس پر کریں ہم اعتماد
بس خدا ہی پر بھروسا چاہئے

زندگی بیگار میں ساری کٹی
اب تو کرنا کام اپنا چاہئے

حجتیں بے شمار حاصل ایک
راستے مختلف ہیں، منزل ایک

خواہشیں ہم کو دی گئیں لاکھوں
اور بخشا گیا، ہمیں دل ایک

باتیں دو چار پوچھنی تھیں ہمیں
کہیں ملتا جو مردِ کامل ایک

Scanned by CamScanner

تاریخی مباحثات

علمائے یورپ کا معیار بحث و نظر

ایک علمی عیار اور ایک محقق علامہ کے مشترکہ نتائج تحقیق!

مئی ۱۸۵۲ء میں، ایک دیہاتی نوجوان پیرس میں وارد ہوا۔ اس کا نام لوکاک فرین تھا۔ کسی قدر نوشت و خواند سے واقف تھا۔ پہلے وہ کسی شہر میں کسی بیرسٹر کے یہاں محرری کے فرائض انجام دیتا تھا، لیکن اس کی حوصلہ مند طبیعت نے آمادہ کیا کہ کسی بڑی جگہ جاکر اپنی ترقی کے مواقع پیدا کرے۔ اس نے پیرس کا رخ کیا اور وہاں پہنچکر اس نے خیال کیا کہ پرانی کتابوں کی تجارت اس کے لئے بہت سود مند ہوگی۔ اس نے کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں آمد و رفت شروع کردی۔ اس کی دلچسپی کا مرکز صرف پرانی کتابیں یا غیر مطبوعہ قلمی نوادر ہوا کرتی تھیں۔ وہ اس قسم کی کتابیں لیکر نہایت انہماک کے ساتھ ان کے مطالعہ میں مشغول ہوجاتا اور جب ذرا محافظین کو غافل پاتا، جلدی سے تیز چاقو جیب سے نکالتا اور کتاب کا کوئی پسندیدہ صفحہ تراش کر جیب میں ڈال لیتا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ اسی حال میں دیکھ لیا گیا۔ بدقسمتی کہئے یا خوش قسمتی کہ ایک دن اس کی ملاقات لیٹلے نامی ایک شخص سے ہوگئی جس کو جھوٹے شجرات تصنیف کرنے میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ وہ اپنے اسی ہنر سے ان دولتمندوں سے روپیہ وصول کیا کرتا تھا جو دفعتہً دولت پاکر دولت مند ہوجاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ نسب میں بھی کسی سے نیچے نہ رہیں۔ لوکاک فرین نے لیٹلے کو اپنا استاد بناکر اس سے کسب کمال کرنے لگا اور ساتھ ہی پرانی کتابوں کی تجارت بھی جاری رکھی۔ اس زمانہ میں فرانس میں ایک بہت بڑا عالم تھا جس کا نام میشیل شال تھا۔ یہ فرانس کی علمی اکاڈمی کا ایک ممتاز رکن تھا۔ قدیم تاریخی مخطوطات وغیرہ سے اس کی دلچسپی حد شہرت کو پہنچی ہوئی تھی۔ لوکاک فرین نے اس سے راہ و رسم پیدا کرلی اور ۱۸۶۱ء میں مشہور شاعر موسیو کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط پیش کیا جس کو شال نے ایک پرانی کارآمد یادگار سمجھکر ۵۰۰ فرانک میں خرید لیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ لوکاک فرین اسی قسم کی قدیم چیزیں پیش کرتا اور منھ مانگی قیمت وصول کرتا، یہانتک کہ ۸ ہی سال کے اندر تقریباً ۲۷۳۲۰ نوادر فروخت کیں اور

ان کے عوض میں علامہ سے ۱۴۰۰۰ فرانک وصول کئے۔ نوادر کے اس مجموعہ میں گذشتہ زمانہ کے مشاہیر، بقراط، ہیرڈوس، ورجل، مولیسیر، روسو، وولیٹر، جان ڈارک اور لویس وغیرہ سب ہی کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتابیں اور خطوط وغیرہ تھے لیکن علامہ میشیل شال کی نظروں میں ان میں سب سے زیادہ قیمتی چیز پاسکل اور نیوٹن کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے خطوط تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ قانون کشش کا راز معلوم کرنے والا پاسکل فرانسیسی ہے نہ کہ نیوٹن۔ وہ ان تاریخی شہادتوں کو پاکر بہت خوش تھا، ان کو آنکھوں سے لگاتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس حربہ سے فرانس، انگلستان سے بازی جیت لیگا۔ ۱۸۶۶ء میں علمی اکاڈیمی کی صد سالہ جوبلی پیرس میں منائی گئی اور ایک سال کے بعد، اس اکاڈیمی کے تمام اراکین، علامہ میشیل شال کا پرازمعلومات مقالہ سننے کے لئے جمع ہوئے۔ میشیل نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے قدیم ذخیرہ میں سے دو پرانے شعرا کے دو خطوط بھی پیش کئے اور بڑے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ "وہ عنقریب اپنے ایک دوسرے لکچر میں مستند تاریخی دلائل سے ثابت کریں گے کہ قانونِ جاذبیت کا معلوم کرنے والا پاسکل ہے نہ کہ نیوٹن"۔

یہ اعلان علمائے فرانس کے لئے قدرتی طور پر مژدۂ جانفزا تھا۔ وہ اس کو سنکر بہت خوش ہوئے اور بے چینی اور شوق کے ساتھ اس تاریخ کا انتظار کرنے لگے جب علامہ موصوف اپنا لکچر ارشاد فرمائیں گے۔ خدا خدا کرکے ۱۵ جولائی کا دن آیا اور اس اہم لکچر کو سننے کے لئے لوگ جمع ہوئے۔ تمام علمی مجالس نے اس لکچر کو سننے کا خاص طور سے اہتمام کیا جب علامہ نے خود پاسکل اور نیوٹن کے خطوط پیش کرکے ثابت کردیا کہ دراصل اس قانون کا معلوم کرنے والا پاسکل ہے نہ کہ نیوٹن، تو حاضرین کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ ہر طرف سے احسنت و مرحبا کی صدائیں اٹھیں۔ اکاڈیمی نے ان تاریخی شہادتوں کو فوراً زیورِ طبع سے آراستہ کیا اور ملک اور بیرون ملک ہر جگہ ان کی اشاعت کی۔ اس کے بعد شال نے اپنے اس نظریہ کی تائید کے لئے اور دوسرے خطوط بھی پیش کئے۔ اکاڈیمی میں شال کے اس جدید نظریہ سے اگرچہ کسی کسی نے اختلاف بھی کیا لیکن فرانس کی رائے عامہ نے پورے جوش و خروش کے ساتھ تائید کی اور اس عظیم الشان علمی کامیابی پر خوشیاں منائیں۔ قبول و مرحبا کی صداؤں نے شال کی ہمت بڑھائی۔ انھوں نے قانون جاذبیت کے علاوہ دوسرے امور کے متعلق بھی تمام تاریخی نوادر کو نکالنا شروع کردیا۔ گلیلیو کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط بھی پیش کئے جن سے فرانس کے لئے دوسری علمی عظمتیں ثابت ہوتی تھیں۔ شال کی ان جدید تحقیقات اور نئے تاریخی دلائل نے تمام علمی حلقوں میں ایک ہلچل ڈالدی۔ ہر جگہ سے تائید یا اختلاف کی صدائیں اٹھنے لگیں۔ اور ایک علمی بحث نے ایک عالمگیر جنگ کی شکل اختیار کرلی، جس میں خصوصیت کے ساتھ انگریزوں نے

حصہ لیا کیونکہ وہ کسی طرح پسند نہیں کرسکتے تھے کہ فرانس ان کے اس سرمایۂ فخر و عزت کو چھین لے جائے جو نیوٹن نے بخشا تھا اور جس کے وہ اب تک مالک تھے۔ اس لئے انھوں نے ان تمام خطوط کا بالکلیہ انکار کردیا اور اصرار کرتے رہے کہ قانون جاذبیت کے انکشاف کا فخر نیوٹن ہی کو حاصل ہے، اس فخر کو پاسکل یا اور کوئی چھین نہیں سکتا۔ اٹلی نے بھی اس جنگ میں نمایاں حصہ لیا کیونکہ گلیلیو کا نام بھی اس معرکۂ جنگ میں بار بار لیا جاتا تھا اور متعدد خطوط اس کے نام کے بھی پیش ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس جنگ کے شرارے دوری کے باوجود امریکہ وغیرہ تک بھی پہنچے۔ اس جنگ نے یہاں تک اہمیت حاصل کی کہ فرانس کے پریسیڈنٹ کو بھی میدان جنگ میں اترنا پڑا انھوں نے سرکاری طور پر پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ اکاڈیمی کی شائع کردہ تمام تاریخی دستاویزیں اصلی اور قابل اعتماد ہیں۔ اب تک فرانس کے بعض اخبارات بھی ان تاریخی خطوط کو شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے لیکن رئیس جمہوریت کے اس اعلان کے بعد شک کی گنجائش باقی نہ رہی۔ فرانس کی پبلک نے اس فتحمندی پر بہت زیادہ مسرت کا اظہار کیا اور دنگل میں نیوٹن پر پاسکل کی ظفریابی دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ یہ قلمی جنگ دو سال تک جاری رہی اور جب وقت آیا کہ فریقین تھک کر ہتھیار ڈال دیں دفعتہً وینس سے گلیلیو کے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند مستند خطوط کی عکسی تصویریں پہنچیں جن کو دیکھ کر پیرس کے قابل اعتماد ماہرین فن نے فیصلہ کردیا کہ میشیل شال کے پیش کردہ خطوط جعلی ہیں۔ ۱۹ جولائی ۱۸۶۹ء کی تاریخ بھی عجیب و غریب تاریخ تھی۔ اس دن جب علامہ شال اکاڈیمی کے جلسہ میں آئے یا لائے گئے تو انھوں نے خود ان کے جعلی ہونے کا اقرار کرلیا۔ اس وقت علامہ کی ندامت اور شرمندگی کا جو حال تھا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے آج ان کو معلوم ہوا کہ اب تک وہ کس غفلت میں تھے اور لوکاک فرین نے کس طرح ان کو فریب دیکر ان کی ساری شہرت و عزت کو خاک میں ملا دیا۔ اس فوری انقلاب حال کی خبر ہر جگہ تیزی سے پھیل گئی اور اس کا بڑا چرچا ہوا لیکن فرانس کے اخبارات نے بالکل خاموشی اختیار کرلی۔ ندامت اور خوف شماتت نے ان کی زبان بندی کردی۔ لوکاک فرین گرفتار کیا گیا اور جعل سازی کے جرم میں اس پر مقدمہ چلایا گیا لیکن اس نے اپنے بیانات میں بڑی احتیاط برتی ۔ ۔ ۔ وہ آخر وقت تک اس پر اڑا رہا کہ ان "نوادر" کا اکثر حصہ صحیح ہے البتہ اس نے اعتراف کیا کہ پاسکل اور نیوٹن کے خطوط ضرور جعلی ہیں۔ اس نے اپنے اس جرم پر یہ دلچسپ معذرت پیش کی کہ میرا کیا قصور یہ علامہ شال اسی قسم کے قدیم مخطوطات کے عاشق زار تھے۔ مگر ماہرین نے عدالت کے روبرو اپنا بیان پیش کیا کہ یہ ذخیرہ تمام جعلی ہے۔ لوکاک فرین نے شال کو ان مخطوطات کے متعلق یقین دلایا تھا کہ یہ تمام قیمتی ذخیرہ مشہور راہب الکوین کے پاس جمع تھا اور اسی نے [illegible] کے لگ بھگ فرانسیسی زبان میں

Scanned by CamScanner

ان کا ترجمہ کیا تھا لیکن ماہرین فن نے فیصلہ کر دیا کہ اگرچہ اس جعل کا بنانے والا بڑا ماہر اور قدیم تاریخ سے بخوبی واقف ہے لیکن اسلوب اور خیالات اس جعل کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، اسی وقت یہ راز بھی کھلا کہ لوکائی فرین ان جعلی خطوط کو تانبے کے سرمہ سے ملی ہوئی روشنائی سے لکھتا تھا اور کاغذ کو قہوہ میں ڈال کر خشک کر لیتا تھا تاکہ اس پر قدامت کے آثار پیدا ہو جائیں۔ بہرحال لوکائی فرین مجرم کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوا لیکن دو چیزوں نے لوگوں کی ہمدردی اور توجہ کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ ایک اس کی جد و جہد نے کہ چند سال میں ۶۶۰ مشاہیر کے ۲۷۳۲ خطوط تصنیف کئے، دوسری فرانس کی بے پایاں محبت نے کہ اس کی عظمت بڑھانے کے لئے اس نے بے شمار داستانیں وضع کیں۔ بالآخر اس کو دو سال قید اور ۵۰۰ فرانک جرمانہ کی سزا ہوئی، لیکن علما شال کی سزا اس سے بھی زیادہ تھی کہ انھوں نے اپنی دولت، ثروت، شہرت ساری چیزیں کھو دیں۔

ا۔ ش

امید و یاس

پروفیسر ڈونالڈ لیرڈ کا ایک دلچسپ مضمون الہلال مصر نے شایع کیا ہے جس کی تلخیص یہ ہے:۔

دور جدید کے انکشافات میں سے ایک اہم انکشاف یہ ہے کہ ہر انسان پر بغیر کسی معلوم سبب کے امید و یاس، خوشی و غم کے مختلف جذبات طاری ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی بیٹھے ہی بیٹھے اس کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ عالم تمام مجموعۂ غم ہے۔ اور کبھی بغیر کسی خاص سبب کے اس کا دل، خوشی و نشاط سے لبریز ہو جاتا ہے اور اس کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ زندگی ایک بڑی نعمت اور دنیا یکسر تصویر مسرت ہے۔ یہ دو مختلف جذبات وقتاً فوقتاً ہر انسان پر طاری ہوتے رہتے ہیں۔ انہی دوروں کو علمائے علم النفس دور شعور یا کیفیاتی دور کہتے ہیں۔ انسان پر غم و مسرت کے یہ دو مختلف دور ہمیشہ گذرتے ہیں، حقیقت میں ان کو زندگی کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ محض نتیجے ہوتے ہیں ہمارے عواطف و مشاعر کے اتار چڑھاؤ کے۔ اسی کے ماتحت کبھی ہم خوش رہتے ہیں اور کبھی غمگین۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ غم و مسرت کے جذبات جسم اور عقل کی پیداوار ہیں۔ یہی دونوں ملکر ان جذبات کو پیدا کرتے ہیں، جمع کرتے ہیں اور پھر ایک خاص نظام کے ماتحت ان کو تقسیم کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے دوروں کی مدت باری باری عموماً چار ہفتہ سے لیکر پانچ ہفتہ تک رہتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس عالم آب و گل میں ہر انسان پر حزن و غم اور فرحت و مسرت کے جذبات باری باری طاری ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی اس کا دل اپنے اہل و عیال، دوست احباب، صحت و کاروبار ہر ایک چیز کو دیکھ کر خوشی سے اچھلنے لگتا ہے اور کبھی انہی چیزوں کو

دیکھ کر اس کی مایوسی چھا جاتی ہے۔ جذبات کے اسی مدّ و جزر میں اسکی زندگی بسر ہوتی ہے۔ اگر انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ ہر شخص کا ان دو مختلف کیفیاتی دوروں کے یکے بعد دیگرے گذرنا ضروری ہے تو بہت سی مشکلیں اس پر آسان ہو جائیں اور وہ کبھی زندگی کی کشاکش کے سامنے سپر انداز نہ ہو۔

جب انقباض کا دور شروع ہوتا ہے تو کسی چھوٹی سی بات سے طبیعت میں انقباض پیدا ہو جاتا ہے پھر چند قدم آگے بڑھنے پر کوئی دوسرا ناگوار حادثہ پیش آ جاتا ہے اور چند لمحے کے اندر پے در پے اسباب انقباض پیش آکر انسان کو مخبوط کر دیتے ہیں۔ دنیا اس پر تاریک ہو جاتی ہے۔ کوئی شعاع امید نظر نہیں آتی۔ وہ مایوس ہو کر بسا اوقات خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے حالانکہ یہ دور ظلمت و یاس دیرپا نہیں جلد ہی مسرت و شادمانی کا دور شروع ہونیوالا ہے جس کے بعد دور انقباض رخصت ہو جائیگا۔

بعض علمائے علم النفس کا جنھوں نے ان کیفیاتی دوروں کی علمی حیثیت سے تحقیق کی ہے خیال ہے کہ ان کیفیاتی دوروں میں سے ہر ایک دور کی مدت تقریباً چار ہفتہ ہوتی ہے۔

فرحت و انبساط کے دور میں انسان اپنے تئیں سمجھتا ہے کہ وہ جنتِ فردوس میں ہے اور اسکے گرد و پیش کی ساری چیزیں خوشگوار اور فرحت زا نظر آتی ہیں۔ اور جب انقباض کا دور شروع ہوتا ہے تو دنیا اسکو دوزخ نظر آتی ہے اور پوری کائنات سوگوار اور یاس و حسرت کی تصویر معلوم ہونے لگتی ہے۔ ان کیفیات کا اثر قدرتی طور پر انسانی اعمال و افکار پر بھی پڑتا ہے آج مزدوروں اور مالکوں کے درمیان یا باہم لوگوں کے درمیان جو شکوہ شکایتیں، لڑائی جھگڑے یا اسکے برعکس حالات رونما ہوتے ہیں وہ زیادہ تر اسی کیفیاتی دور کا نتیجہ ہیں۔ یہ معلوم ہونیکے بعد ہم ایک ایسے اہم نتیجہ تک پہنچتے ہیں جو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے جب یہ معلوم ہو چکا کہ انسان پر ان متضاد جذبات کا باری باری طاری ہونا ضروری ہے تو اسکے لئے بہت آسان ہے کہ دور انقباض کو خوش آمدید کہنے کیلئے پہلے ہی سے تیار ہو جائے اور یقین کر لے کہ اس دور کے بعد یقیناً مسرت کا دور شروع ہوگا جو انقباض کا خاتمہ کر دیگا۔ انسان اگر اس نتیجہ تک پہنچ جائے اور اپنے اور اپنے خاندان کے دور مسرت اور دور انقباض کی مدتوں کو تعین کر کے ٹھیک ٹھیک معلوم کر لے تو اسے یقیناً مختلف قسم کی پریشانیوں اور نا امیدیوں سے نجات مل جائیگی اور بیوی بچوں کی طرف سے مایوسی یا بے اطمینانی زیادہ پیدا نہ ہوگی۔ یہی نہیں بلکہ ان دوروں کا راز معلوم کر لینے کے بعد انسان دوسروں کے انقباض و ملال کی اٹکل پچو توجیہوں کے بجائے ان کی صحیح علت معلوم کر سکتا ہے اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کو بہت سے وہمی غموں سے نجات مل جائیگی اور عموماً بدگمانیوں کی بنا پر دوستوں اور عزیزوں کے جو تعلقات منقطع ہوتے رہتے ہیں انکا سلسلہ بند ہو جائیگا۔

قارئین کرام بڑے بڑے لوگوں کی خودکشی کے ان واقعات کو بھولے نہ ہونگے جو پچھلے چند دنوں کے اندر پیش آئے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ مسٹر کروجر اور مسٹر ایسٹمین جیسے مشہور لوگوں نے خودکشیاں کریں اور خدا جانے اس طرح ابتک کتنی جانیں تلف ہوئیں۔ یہ تمام خودکشیاں کیوں ہوئیں؟ حقیقت میں یہ محض اسی کیفیاتی دور یعنی دور انقباض کا نتیجہ تھیں۔ اگر یہ خودکشی کرنے والے جذبات کے ان دوروں سے واقف ہوتے اور انکو یہ یقین ہوتا کہ ہر انسان پر یہ دورے پڑتے ہی رہتے ہیں تو ہرگز زندگی سے گھبرا کر خودکشی پر آمادہ نہ ہوتے۔

ع۔ د

Scanned by CamScanner